ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ترجمان

نیا دور

مئی ۲۰۲۵ء

محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اترپردیش

۱۵/روپے

جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ گورکھپور میں اسمارٹ سٹی کے تحت شہید بندھو سنگھ ملٹی لیول پارکنگ کا افتتاح کرتے ہوئے۔

جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ فنکاروں کے ذریعہ اسٹیج پر پیش کئے جانے والے ڈرامائی مناظر کو دیکھتے ہوئے۔

جلد:80 شمارہ:01

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

مئی ۲۰۲۵ء

سرپرست

جناب سنجے پرساد

پرنسپل سکریٹری، محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

پبلشر: جناب وشال سنگھ (ڈائرکٹر، انفارمیشن)

جناب اروند کمار مشر (ایڈیشنل ڈائرکٹر، انفارمیشن)

ایڈیٹر

آسیہ خاتون

7705800986

Email:nayadaurmonthly@gmail.com

معاون

شاہد کمال

رابطہ برائے سرکولیشن وزرِ سالانہ:

صبا عرفی:7705800953

تزئین کار: ایم. ایچ. ندوی

مطبوعہ: پرکاش پکچرس، گولہ گنج، لکھنؤ

شائع کردہ: محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

زرِ سالانہ: ۱۸۰/روپئے

ترسیل زر کا پتہ

ڈائرکٹر انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پنڈت دین دیال اُپادھیائے سوچنا پریسر، پارک روڈ،

اتر پردیش، لکھنؤ 226001

Pleas send Cheque/Bank Draft in favour of Director,Information & Public Relation Department,Pandit Deendayal Upadhyay Soochna Parisar,UP,Lucknow

خط وکتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعہ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

اس شمارے میں...

اداریہ	اپنی بات	۲

مضامین

عبدالغنی شیخ کی ناول نگاری	ڈاکٹر رقیہ بانو	۳
راشد الخیری کا 'عروسِ کربلا' تنقیدی جائزہ	سرور مہدی	۶
ناول بستی کا نو آبادیاتی جائزہ	محمد فرید	۱۰
جیلانی بانو 'ایوانِ غزل' ایک تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر سعدیہ سلیم شمسی	۱۳
'میرے ہونے میں کیا برائی ہے' کا تنقیدی جائزہ	پرواز احمد	۱۵

منظومات

غزل	محمد مشہود علی	۹
غزلیں	رضوان بیگ مرزا/جمیل احمد جمیل	۱۸
غزلیں	کمال بلیاوی/شان علی مصباحی	۱۹
غزل	میکش اعظمی	۲۰

افسانے

درخت	شاہد اختر	۲۱
روح کا تبسم	سراج فاروقی	۲۴
چھن	نصرت شمسی	۲۷

افسانچے

مندر کا گھنٹہ، بریک	ڈاکٹر اسرار الحق قریشی	۲۹
بصیرت	محمد زماں	۳۰

تبصرہ

خالد محمود: شخصیت اور ادبی خدمات	بے نظیر	۳۱

ترقیات

اتر پردیش: فارما اور صحت کے شعبے میں سرمایہ کاری	ہشام غزالی	۳۲

ماہنامہ نیا دور، information.up.nic.in ویب سائیٹ پر دستیاب ہے۔

قیمت فی شمارہ: پندرہ روپئے سالانہ رکنیت فیس: ایک سو اسّی روپئے

دو سال کی رکنیت فیس: تین سو ساٹھ روپئے

تین سال کی رکنیت فیس: پانچ سو چالیس روپئے

نوٹ: اپنی کمپوز شدہ تخلیقات، مندرجہ ای: میل آئی ڈی پر ہی ارسال کریں۔

E:mail:nayadaurmonthly@gmail.com

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

اپنی بات

مئی ۲۰۲۵ء کا شمارہ قارئین کرام کی خدمت میں حاضر ہے۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

''ماہنامہ نیا دور'' کی تازہ پیش رفت اپنے قارئین کی خدمت میں حاضر ہے۔اس سے پہلے کے شماروں میں جو مقدماتی معروضات اداریہ میں ضبطِ تحریر کئے گئے تھے،اُسی سلسلے کی یہ تیسری کڑی ہے۔عالمی سطح پر اردو زبان کے زوال کے خود ساختہ سانحہ پر نوحہ گری ہماری اردو دنیا کا ایک انتہائی دلچسپ موضوع بنتا جارہا ہے۔بات اب یہاں تک آن پہونچی ہے کہ اردو کے فروغ کی ساری گفتگو ایک انقلابی اور سیاسی سلوگن سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ،افسوس تو اسی بات کا ہے کہ اردو کے خلاف اس عملی بدزبانی کا یہ سلسلہ کم ازکم اس موجودہ عہد سے ہی تعلق نہیں رکھتا بلکہ اس ،بدشگونی کے قصہ مختصر کا زمانی دورانیہ کافی وسیع ہے۔اگر ہم شیخ غلام مصطفی ہمدانی مصحفی کے شعر کا وہ مصرعہ اولی جسے اپنے اداریہ کا عنوان منتخب کیا تھا۔

خدا رکھے زباں ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے

مذکورہ شعر بھی اسی زمرے میں آتا ہے،حالانکہ مصحفی بذات خود اردو زبان کے ایک قدآور شاعر ہیں لیکن وہ بھی اردو زبان سے بے اعتنائی کے اظہار میں قدرتامل سے کام لیتے ہوئے نظر آتے ہیں،انھوں نے اردو کے ستائش اور اس کے آفاقی وجود کے اعتبار کے لئے میر تقی میر اور مرزا غالب جیسے عظیم شاعروں کے نام کو اپنے اظہار خیال کے لاحقہ کے طور پر استعمال کرتے ہوئے یہ کہنے سے قطعی گریز نہیں کرتے کہ اگر اردو زبان کو میر و غالب جیسے شاعر نصیب نہ ہوتے تو ہمیں اردو زبان کو اپنی زبان کہتے ہوئے شرمندگی محسوس ہوتی۔مصحفی کا اردو زبان کے حوالے سے یہ صریحی احتراز قابل غور ضرور ہے۔حالانکہ جس عہد میں انھوں نے اردو زبان کو اردو زبان کہا ہے غالباً یہ وہی عہد تھا جس عہد میں اردو زبان باضابطہ طور پر اپنے نیم تعارف سے ایک جامع تعارف کی طرف پیش رفت کررہی تھی۔چونکہ اس سے پہلے اردو کو اردو نہ کہہ کر اسے ریختہ ہی کہا جاتا تھا۔جیسا کہ غالب نے بھی اس کا اپنے متعدد اشعار میں کیا ہے ملاحظہ کریں۔

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

امید کرتی ہوں یہ شمارہ سابقہ شماروں کی طرح پسند خاطر ہوگا۔آپ اپنے قیمتی مشوروں سے ہمیں نوازتے رہیں۔شکریہ

(جاری)

آسیہ خاتون

یہ شمارہ مئی ۲۰۲۵ء کا ہے جس کو اپریل ۲۰۲۶ء میں شائع کیا جارہا ہے۔

ڈاکٹر رقیہ بانو

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی

8899648389

عبدالغنی شیخ کی ناول نگاری

> ''ناول کا کینوس کا بہت وسیع ہوتا ہے ،اور اس میں اپنے دور کی بہترین عکاسی ہوتی ہے۔ اپنے دور کے حالات و واقعات، رہن سہن، طرز معاشرت ،تہذیب و تمدن، کلچر، غرض انسانی زندگی اور اسے جڑے تمام موضوعات اس کے دائرے میں آسکتے ہیں۔ عبدالغنی شیخ نے اپنی تخلیقات میں لداخ کی صورت حال کا دانشورانہ تجزیہ کرتے ہوئے لداخ کے ماضی اور حال کی عکاسی بڑی جرات مندانہ اور حقیقت پسندانہ رویہ سے کیا ہے، ان کا ناول ''وہ زمانہ'' میں گویا لداخ کی تاریخ بیان کر دی ہے۔ظاہری بات ہے ناول میں تاریخ کو یوں تو ہو بہو نہیں دہرایا جاتا، ناول تاریخ ہے بھی نہیں لیکن جن چیزوں کو تاریخ بیان نہیں کر پاتی، ناول انھیں بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔''

لداخ میں ناول نگاری پر ابھی تک کوئی نمایاں کام نہیں ہوا ہے۔لیکن جو ناول منظر عام آئے ہیں ان کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ ہم ان ناولوں کو پڑھ کر اس خطے کی تہذیب وتمدن، رسم ورواج اور طرز معاشرت کے بارے میں کافی معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

خطے لداخ کے ناول نگاروں میں سب سے اہم نام عبدالغنی شیخ کا ہے، عبدالغنی شیخ کی پیدائش ۱۹۳۶ء میں لیہہ لداخ میں ہوئی، اور ان کا انتقال ۲۰ اگست ۲۰۲۴ء میں ہوا۔انھوں نے ابتدائی تعلیم لیہہ میں حاصل کی اور ۱۹۵۱ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد سرینگر آگئے۔ پڑھنے لکھنے کا شوق بچپن سے تھا، اس لیے طالب علمی کے زمانے سے ہی لکھنا شروع کیا۔ان کے دو ناول اور تین افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔''لداخ تہذیب وثقافت''لداخ کی تاریخ اور تہذیب وثقافت کے حوالے سے ایک اہم کتاب ہے ان کی ایک سوانح عمری''صنم نربو''لداخ کے نامور انجنیر صنم نربو کے حالات زندگی اور کارناموں کے حوالے سے چھپ کر منظر عام آچکی ہے۔اس کے علاوہ ان کی تصانیف میں''قلم،قلمکار اور کتاب''ایک دلچسپ کتاب ہے جس میں ادیبوں کے تخلیقی محرکات کو دلنشیں انداز میں تحریر کیا گیا ہے''اسلام اور سائنس'' کے موضوع پر بھی ان کی ایک کتاب منظر عام آچکی ہے ان کے علاوہ لداخ کے موضوع پر مختلف مضامین اور مقالے مختلف اخبارات اور رسائل وجرائد میں چھپتے رہے ہیں۔انھوں نے تقریباً بارہ ممالک کے ادبی کانفرنسوں میں شرکت کر کے مقالے پیش کیے ہیں۔ان کے افسانوں کا انگریزی کے علاوہ تیلگو، جرمن، بنگالی اور گجراتی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔خطہ لداخ میں اردو زبان وادب سے شغف رکھنے والے متعدد افراد اردو زبان میں تخلیقی کام انجام دے رہے ہیں، چاہے وہ شاعری ہو یا نثری ادب لیکن باقاعدہ لکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہیں، اب تک گنتی کے چند نام ایسے ہیں جن کی تصانیف چھپ کر منظر عام پر آچکی ہیں۔ان میں نمایاں نام کاچو سکندر خان، اکبر لداخی، منشی عبدالستار، کاچو اسفندیار خان، عبدالغنی شیخ، عبدالحمید تنویر، عبدالرشید راہگیر اور خیال لداخی کے ہیں۔مذکورہ ناموں میں ادبی حیثیت عبدالغنی شیخ کا نام اور کام اہمیت کا حامل ہے جو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں مسلسل لکھتے رہے ہیں۔

لداخ کی تاریخ، تہذیب وثقافت پر شیخ صاحب کی کہانیاں اور مضامین ریاستی اخبارات ورسائل کے علاوہ بیرون ریاست کے رسائل وجرائد میں بھی چھپتے رہے ہیں عبدالغنی شیخ نے ہندوستان کے ایک ایسے خطے میں رہ کر اپنی تحریری جدوجہد جاری رکھا جہاں ادبی سرگرمیوں کا کوئی رواج نہ تھا اردو دنیا کو لداخ کے طرز معاشرت، رسم ورواج، رہن سہن سے واقف کروانے میں عبدالغنی شیخ کا بڑا ہاتھ ہے۔اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے انھوں نے اردو ادب میں ایک اہم مقام بنالیا ہے۔ عبدالقیوم ان باتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''انھوں نے لداخ کی تاریخ وثقافت اور ادب میں بہت ساری چیزوں کا کھوج لگایا جس پر زمانے کا دبیز پردہ پڑا ہوا تھا، ان ساری چیزوں کو کھوج نکال کر اردو داں حضرات کو ان سے روشناس کرایا۔انھوں نے لداخ کی تاریخ، جغرافیہ، ادب، رسم ورواج اور ثقافت وغیرہ موضوعات کے علاوہ ماہنامہ''آجکل''نئی دہلی میں دنیا کے سو بہترین ناولوں پر اپنا مقالہ لکھ کر اردو میں وہ کارنامہ سرانجام دیا جو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

(داستان لداخ''(نشاط لائبریری، لیہہ لداخ، 2010)

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہر قلم کار کے تخلیقی شعور کو اس کا ماحول اور گرد و پیش مواد فراہم کرتا ہے جو پہلے مادّی تجربے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ پھر تخلیقی تجربہ اسی سے جنم لیتا ہے، اس لیے فنکار کی شخصیت کے ساتھ ساتھ اس کے عہد کا مطالعہ ضروری ہو جاتا ہے، تب جا کر فن کے اسرار کا دروازہ وا ہو سکتا ہے۔ غنی شیخ کی تخلیقات کو سمجھنے یا ان کی تخلیقات پر اپنی رائے دینے سے پہلے قاری یا نقاد کے لیے ضروری ہے کہ ان کے عہد، ماحول اور حالات کا مطالعہ کریں۔ تب جا کر کہیں ان کی تخلیقات میں چھپی اسرار و رموز تک رسائی ممکن ہو سکتی ہے۔ کیونکہ کوئی بھی قلم کار اپنے گرد و نواح کے حالات و واقعات اور حادثات سے لا تعلق نہیں رہ سکتا، اور پھر حالات و حادثات کی شدت ایسی ہو کہ زندگی کا کوئی شعبہ یا کسی شعبے سے وابستہ کوئی بھی فرد متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے تو قلم کار کے قلم حالات و واقعات کے گرد گھومتا ہے اور وہی چیزیں پیش کرتا ہے جن کا تعلق اس کی زندگی، تہذیب و تمدن، ثقافت اور حالات و اقعات سے ہوتا ہے۔ عبدالغنی شیخ چونکہ لداخ سے تعلق رکھتے ہیں، جہاں ماضی قریب تک زندگی سخت اور مشکل تھی، تعلیم کی روشنی یہاں دیر سے اور دور سے پہنچی، اس لیے یہ خطہ ملک کے باقی کئی حصوں کے مقابلے میں پس ماندہ رہی، عبدالغنی شیخ نے جب ایسے خطے میں بیٹھ کر لکھنا شروع کیا تو یقیناً ان کے لیے ابتدا میں کئی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا اور چونکہ ان کی تخلیقات میں لداخ کی عکاسی بدرجہ اتم موجود ہے وہ اپنی کہانیوں کی فضا لداخ سے تیار کرتے ہیں اور اپنی کہانیوں میں لداخ کی تہذیب و ثقافت، طرز معاشرت، تمدن، سیاست، حالات و واقعات کی عکاسی بڑی فنکاری سے کرتے ہیں۔ اس لیے اردو دنیا کو خطہ لداخ سے متعارف کرانے کا سہرا ان کے سر جاتا ہے۔

ناول کا کینوس بہت وسیع ہوتا ہے اور اس میں اپنے دور کی بہترین عکاسی ہوتی ہے۔ اپنے دور کے حالات و واقعات، رہن سہن، طرز معاشرت، تہذیب و تمدن، کلچر، غرض انسانی زندگی اور اسے جڑے تمام موضوعات اس کے دائرے میں آسکتے ہیں۔ عبدالغنی شیخ نے اپنی تخلیقات میں لداخ کی صورت حال کا دانشورانہ تجزیہ کرتے ہوئے لداخ کے ماضی اور حال کی عکاسی بڑی جرات مندانہ اور حقیقت پسندانہ رویہ سے کیا ہے، ان کا ناول ''وہ زمانہ'' میں گویا لداخ کی تاریخ بیان کر دی ہے۔ ظاہری بات ہے ناول میں تاریخ کو یوں تو ہو بہو نہیں دہرایا جاتا، ناول تاریخ ہے بھی نہیں لیکن جن چیزوں کو تاریخ بیان نہیں کر پاتی، ناول انھیں بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔

ناول ''وہ زمانہ'' عبدالغنی شیخ کا ایک اہم اور فکر انگیز ناول ہے جو اپنے عہد کے سماجی، معاشرتی اور نفسیاتی مسائل کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ یہ ناول ماضی اور حال کے تقابلی مطالعے کے ذریعے انسانی اقدار میں آنے والی تبدیلیوں کو موضوع بناتا ہے۔ 'وہ زمانہ' 1977 میں کشمیر مرکنٹائل پریس سرینگر سے شائع ہوا۔ ''وہ زمانہ'' ایک نیم تاریخی ناول ہے اس میں مصنف نے ناول کی کہانی کو تاریخی اعتبار سے بیان کیا ہے۔ مصنف اس ناول کے آغاز میں لکھتے ہیں:

> ''وہ زمانہ ایک ناول بھی ہے اور ایک تاریخ بھی جس کی تخلیق میں ذاتی مشاہدات، یادداشتوں اور متعدد لوگوں اور بزرگوں کے احوال بیان کے علاوہ لداخ پر لکھی گئی 64 سے زائد کتابوں سے استفادہ حاصل کیا ہے۔''

(''وہ زمانہ'' کشمیر مرکنٹائل پریس سرینگر، 1977)

اس ناول کی کہانی کو مصنف نے صیغہ واحد متکلم میں تاریخی اعتبار سے بیان کیا ہے، اس کے مطالعے سے قدیم و جدید لداخ کی تہذیب و تمدن، رہن سہن، طرز معاشرت، تعلیم و تربیت رسم و رواج وغیرہ سے متعلق بھرپور جانکاری حاصل ہوتی ہے۔ جان محمد آزاد اس ناول سے متعلق یوں تحریر کرتے ہیں:

> ''.....اسی دوران آپ کا ناولٹ ''وہ زمانہ'' شائع ہوا جس میں 1947ء سے پہلے کے لداخ کی معاشرتی، ثقافتی اور مجلسی زندگی اور اس کے بعد رونما ہونے والی تبدیلیوں کی جزئیات مزاحیہ اور دلکش پیرائے میں پیش کی گئی ہے۔''

(کلچرا کادمی، سرینگر، 2004، صفحہ:204)

اس ناول میں تاریخ کے اہم واقعات بیان ہوئے ہیں چونکہ ناول کا مرکز لداخ ہے اس لیے لداخ کے تاریخ کے بعض اہم واقعات کو بڑی مہارت سے ناول کے اصل قصے کے ساتھ جوڑا ہے جیسے جیسے ناول کا اصل قصہ یا نقطہ نظر آگے بڑھتا ہے، تاریخی جہات بھی واضح ہوتا جاتا ہے ۲۱۵ صفحات پر مشتمل یہ ناول لداخ کی تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے مصنف کی علمیت اور ذکاوت اور تاریخ سے دلچسپی کا اظہار ہو جاتا ہے۔ عبدالغنی شیخ نے خصوصاً اپنے ناولوں میں لداخ کی ماضی اور حال کی صورت حال کا دانشورانہ تجزیہ کرتے ہوئے لداخ کے ماضی اور حال کی عکاسی حقیقت پسندانہ رویہ کے ساتھ بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ ''وہ زمانہ'' چونکہ ایک نیم تاریخی ناول ہے اور اس ناول کا مرکز قدیم و جدید لداخ ہے اس لیے لداخ کی تاریخ کے بعض اہم واقعات کو بڑی مہارت سے ناول کے اصل قصے کے ساتھ جوڑا ہے جسے ناول کے اصل قصے یا نقطہ نظر کو آگے بڑھانے کے ساتھ ساتھ تاریخی جہات بھی واضح کر دیتا ہے۔ اس سے مصنف کی علمیت و ذکاوت اور تاریخ سے دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔

عبدالغنی شیخ حقیقت نگاری کے قائل ہیں۔ انسان کے خوشگوار مستقبل پر انھیں یقین ہے۔ مایوسی، تلخی اور جارحانہ ذہنیت کی دلخراش جھلکیاں ان کی تحریروں میں نہیں ہیں وہ بے نظمی، بے ربطگی اور خلفشار سے گریز کرتے ہیں اور خیالات، دقیانوسی گمراہی اور رسمی باتوں کے خلاف ہیں۔ ان کے تحریروں میں اردو ادب کے لیے نسبتاً گمنام مگر پیچیدہ خوبصورت علاقے کی عکاسی ہے اور پڑھنے والے ایک نئے ذائقہ سے روشناس ہوتے ہیں۔

''وہ زمانہ'' دراصل ایک ناولٹ ہے اس میں مصنف نے آزادی سے بہت پہلے اور بعد کے لداخ کو تاریخی پس منظر میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اس میں شروع سے آخر تک لداخ کی تہذیب و ثقافت، تمدن، معاشرت، سیاست، حالات و واقعات کی عکاسی بڑی فنکاری سے کی گئی ہے۔ اگرچہ ہم اسے مکمل تاریخ نہیں کہہ سکتے مگر یہ ایک نیم تاریخی ناول ضرور ہے، اس میں جگہ جگہ درحقیقت تاریخی بیانات قلمبند کیے گئے ہیں۔ مصنف نے اپنی بچپن سے لے کر موجودہ دور تک کے لداخ کی تہذیب و تمدن، ثقافت، تعلیم، طرز معاشرت اور رسم و رواج وغیرہ کو تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہے جس سے لداخ میں ہر دور میں آئے اتار چڑھاؤ اور تعلیمی و تہذیبی پیش رفت کے بارے میں ہمیں مکمل جانکاری ملتی ہیں۔

جہاں تک میرا مطالعہ ہے کہ لداخ کی مشترکہ تہذیب و ثقافت، تمدن، معاشرت، سیاست، حالات و واقعات پر مبنی یہ پہلا اور آخری ناول ہے، اس ناول کے متن کا گہرائی سے مطالعہ کرنے سے متن میں پوشیدہ معنی کے مختلف جہات و اشکاف ہو سکتے ہیں ہر تخلیق کے اظہار کا ذریعہ کوئی نہ کوئی تکنیک ہوتی ہے اور یہ انسان کے انگلیوں کی طرح منفرد ہوتی ہے۔ تخلیق کار اپنے واضح یا مبہم مقاصد کو عیاں کرنے کے لیے اپنے ماحول، اپنی زبان، اپنی فکر، اپنے فلسفے، اپنے ادب، مذہب اور تمدن سے چند لوازمات چن لیتا ہے اور اس کوشش میں وہ کامیاب رہے۔

لہٰذا مصنف نے جس اسلوب بیان اور تکنیک کا استعمال کیا ہے وہ بھی قابل تعریف ہے۔

مصنف کو اردو زبان پر کافی عبور حاصل ہے۔ وہ لداخ کے واحد مصنف ہیں جن کی اردو اور انگریزی میں کئی کتابیں چھپ کر منظر عام پر آچکی ہیں۔ آپ وقتاً فوقتاً مختلف اخبارات، رسائل وجرائد کے لیے مقالات اور مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ آپ کا اسلوب بیان صاحب، دلکش اور عام فہم ہے۔ اس ناول کے مطالعے سے قاری تھوڑی دیر کے لیے قدیم و جدید لداخ کے منظر میں کھو جاتے ہیں اور اپنی آنکھوں کے سامنے پورا لداخ چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ لداخ کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے والوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ہے۔ ایک قاری اس کتاب کے مطالعے سے پرانے اور نئے لداخ کے بارے میں بہت سارے مواد حاصل کر سکتے ہیں اور ان دونوں کے درمیان موازنہ کر سکتے ہیں۔ پرانے اور نئے تہذیب کا تصادم۔ نئے اور پرانی نسل کے رہن سہن، طرز معاشرت وغیرہ کے بارے میں اچھی جانکاری حاصل کر سکتے ہیں۔

"دل ہی تو ہے" ان کا دوسرا ناول ہے۔ یہ ایک رومانی ناول ہے جو 1978ء میں چھپ کر منظر عام پر آیا۔ "دل ہی تو ہے" لیہہ کے پس منظر میں لکھا جانے والا پہلا رومانی ناول ہے۔ خطہ لداخ کے ننگے پہاڑ اور ریتیلے میدان جو صدیوں سے خاموش اور گم سم تھے اچانک سیاحوں کی آمد سے جاگ اٹھتے ہیں۔ سیاحوں کی آمد سے جہاں متعدد لوگوں کی اقتصادی خوشحالی یقینی بن جاتی ہے، وہیں اس سرزمین کے لوگوں کا ذہنی سکون، ان کی انفرادیت اور معصومیت مجروح ہونے لگتی ہے جیسے کہ ناول کی ایک کردار مس کارلا کہتی ہے:

"......لیکن بہت جلد آپ لوگوں کو سکون کی تلاش میں چنگ تھنگ
اور نوابرہ جانے کی ضرورت پڑے گی۔ لیہہ میں نئی تہذیب اپنی برکتوں
کے ساتھ اپنے دامن میں لعنتیں اور مصیبتیں بھی لا رہی ہے۔"

ایک دوسری جگہ جب ناول کا ایک کردار یہ خوشخبری اپنے ساتھیوں کو سناتا ہے کہ نوبراہ بھی سیاحوں کے لیے کھل رہا ہے تو ایک سیاح کہتا ہے:

"سیاحوں کے جانے سے نوبراہ والوں کا سکون ختم ہو گا میں نے
سنا ہے کہ نوابرہ کے لوگ بڑے ہشاش بشاش اور زندہ دل قسم کے
لوگ ہیں لیکن سیاح ان کی مسرت بھری خلوت کی زندگی میں خلل
انداز ہوں گے اور وہ روپیہ کے پھیر میں پڑ جائیں گے۔"

اس طرح سیاحوں کی آمد سے فائدے کے ساتھ ساتھ جو نقصانات پہنچ رہا ہے اس کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ اس ناول کا ہیرو سونم سرینگر سے ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کر کے جب کچھ دنوں کے لیے لیہہ واپس آتا ہے تو اسے یہاں کی ہر چیز بدلی بدلی نظر آتی ہے۔ یہاں ہر ایک شخص غیر ملکی سیاحوں سے زیادہ سے زیادہ پیسہ بٹورنے میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ سونم کا چچا سونم کو بھی نتیجہ نکلنے تک ٹورسٹ گائیڈ بنا دیتا ہے۔ اس دوران وہ پدماں سے ملتا ہے جو اس کی بچپن کی ساتھی ہے جو برسوں سے اس کی راہ میں آنکھیں بچھائی ہوئی ہے جو اب بھی اسے ٹوٹ کر محبت کرتی ہے۔ پدماں سونم کی نس نس میں پیار کی جوت جگاتی ہے۔ گھر والے دونوں کی شادی کے لیے راضی ہو جاتے ہیں لیکن پھر اچانک مغربی تہذیب کی ایک تتلی نماں سونم کو اپنے حسن سے بلا کر رکھ دیتی ہے۔ سونم پدماں کے خلوص اور وفا کو نظرانداز کر کے نیماں کی طرف بے تحاشہ قدم بڑھاتا ہے لیکن نیماں انجام کار اسے منجدھار میں چھوڑ کر چلی جاتی ہے اور وہ اپنی جذبات پر نادم ہو کر آخر پدماں کے پاؤں میں گر جاتا ہے۔ جان محمد آزاد اس ناول کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

"یہ ایک سیدھی سادھی کہانی ہے، اس کے مفہوم ومعانی میں کوئی
پیچیدگی یا تہہ داری نہیں۔ رومانی آرزومندی کی یہ کوشش اگرچہ
جدید ادبی تقاضوں کے میزان ومعیار پر کھری نہیں اتر سکتی۔ تاہم
مصنف نے اپنے ماحول کی جو پرخلوص عکاسی کی ہے وہ لائق ستائش
ہے۔ غالباً اسی بات کے پیش نظر ریاستی کلچرل اکادمی نے مصنف کو اس
کتاب کے لیے ایوارڈ دیا تھا۔"

(جموں وکشمیر کے اردو مصنفین، کلچرل اکادمی سرینگر، 2004، صفحہ:205-206)

عبدالغنی شیخ کو زبان پر کافی دسترس حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے من پسند الفاظ بروئے کار لانے میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوتی اور ان کی نثر میں بھی نظم کا رسیلا پن موجود ہے۔ زبان صاحب شستہ، سادہ اور عام فہم ہے ان کے کردار ان کے اپنے ماحول معاشرے اور وراثت کے علمبردار ہیں مختصراً عبدالغنی شیخ کی ناول نگاری میں حقیقت نگاری اور جدید شعور کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ وہ فرد کے اندرونی کرب، تنہائی اور شناخت کے مسائل کو نہایت سنجیدگی سے پیش کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے ناول محض کہانیاں نہیں بلکہ سماجی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں ان کی ناول نگاری اردو ادب میں اس لیے اہم ہے کہ انھوں نے علاقائی تجربے کو آفاقی شعور کے ساتھ جوڑ کر پیش کیا۔ ان کے ناول فکری گہرائی، سماجی شعور اور فنی پختگی کے حامل ہیں، جو قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔

کتابیات

آزاد خان محمد 2004ء جموں وکشمیر کے اردو مصنفین کلچرل اکادمی سرینگر
عبدالغنی شیخ 1977ء وہ زمانہ (ناول) کشمیر مرکنٹائل پریس سرینگر
عبدالغنی شیخ 1978ء دل ہی تو ہے (ناول)
عبدالغنی شیخ 1975ء زوجیلا کے آر پار (افسانوی مجموعہ)
عبدالقیوم 2008ء لداخ پر ایک طائرانہ نظر نشاط لائبریری لیہہ لداخ
عبدالقیوم 2010ء داستان لداخ
نورشاہ 2011ء جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار میزان پبلشرز سرینگر

رسائل وجرائد

نام کتاب	سن اشاعت	ناشر
آجکل	1957ء	نئی دہلی
آجکل	1968ء	نئی دہلی
آجکل	1969ء	نئی دہلی
سمپوش	1959ء	نئی دہلی
شیرازہ	1981ء	اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر
شیرازہ (جلد 4)		اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر
شیرازہ	2004ء	اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر
جموں وکشمیر میں اردو ادب کے پچاس سال		
ہمارا ادب	1978-79ء	اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر
ہمارا ادب	1979-80ء	اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر
ہمارا ادب	1980-81ء	اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر
ہمارا ادب	1981-82ء	اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر
ہمارا ادب	1982-83ء	اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر

□□□

سرور مہدی

ایچ ایس کالج، اودا کشن گنج، مدھے پورہ (بہار)

9452259955

راشد الخیری کا 'عروسِ کربلا' تنقیدی جائزہ

مصور غم کے لقب سے مشہور علامہ راشد الخیری ایک دردمند دل اور دل سوز طبیعت کے مالک تھے۔ انھوں نے ڈپٹی نذیر احمد کے طرز تحریر کو آگے بڑھاتے ہوئے خواتین کی زبوں حالی بیان کی لیکن انھوں نے نذیر احمد کی طرح فقط خواتین کی زبوں حالی کے بیان پر اکتفا نہ کیا بلکہ ان کے لئے راہِ نجات بھی تلاش کی۔ اس خصوصیت کی بنا پر انھیں معلّم نسواں بھی کہا گیا۔ راشد الخیری کے یہ دو القاب ان کے طرز تحریر اور اسلوب کا مکمل پتہ دیتے ہیں۔ انھوں نے تفریح طبع یا دل بہلاوے کا سامان فراہم کرنے کے لئے ناول نہیں لکھا بلکہ معاشرے کی اصلاح کی فکر انھیں دامن گیر تھی۔ جب سماج کی حالت رونے کے قابل ہو تو اسلوب میں سوز و گداز کا پیدا ہونا بدیہی امر ہے۔ لہٰذا ان کی تحریر نے دنیا کی آنکھوں سے اشکوں کا خراج وصول کیا۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ان کے معاصرین کے ساتھ ان کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''سرشار نے روتوں کو ہنسایا، شرر نے سوتوں کو گدگدایا۔ راشد الخیری نے کھسیانی ہنسی ہنسنے والوں کو رلایا۔''

راشد الخیری کا پہلا ناول 'حیات صالحہ' ہے جو ۱۸۹۵ء میں لکھا گیا اور ۱۹۰۲ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ اپنے ابتدائی ناول سے ہی راشد الخیری خواتین کے حقوق کے بڑے علم بردار نظر آتے ہیں۔ اس شد و مد سے خواتین کے لئے آواز بلند کرنے کی مثال اردو کیا عالمی ادب میں بھی شاذ نظر آتی ہے۔ ان کے تمام ناولوں سے عورت اس طرح وابستہ ہے کہ اسے جدا کرنا مشکل ہے۔ راشد الخیری ایک کثیر التصانیف ادیب ہیں، انھوں نے ساٹھ کے قریب ناول اور افسانے لکھے۔ معاشرتی ناول، تاریخی ناول، مزاحیہ افسانے اور شاعری سب میں انھوں نے جولانی طبع کے مظاہر دکھائے۔ انھوں نے صبح زندگی، شام زندگی، شب زندگی، اور نوحہ زندگی جیسے معاشرتی ناول لکھے تو یاسمین شام، عروس کربلا، نوبت پنج روزہ، محبوبہ خداوند، اندلس کی شہزادی، امین کا دم واپسیں اور منظر طرابلس جیسے تاریخی ناول لکھے۔ انھوں نے اپنے معاصر شرر کی طرح ہی اتنے تاریخی ناول لکھے ہیں کہ ان کا نام از بر رکھنا مشکل ہے۔ شرر کی طرح راشد الخیری بھی مسلمانوں کو اپنی تاریخ اور شجاعت کے کارناموں سے واقف کرانا چاہتے تھے جسکے لئے انھوں نے تاریخی ناول نگاری کا سہارا لیا۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان کی مذہبی کشمکش ان کے یہاں کئی ناولوں میں نظر آتی ہے۔ عیسائی جن علاقوں میں صاحب اقتدار تھے، وہاں مسلمانوں پر قسم قسم کی زیادتی کرتے رہتے تھے۔ ایسے ناولوں کی نمائندہ مثال 'یاسمین شام' ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ شجاعتوں کے عظیم مظاہروں اور جانباز مجاہدوں سے بھری ہے۔ راشد الخیری نے ان مجاہدین کے احوال ناولوں میں لکھتے وقت بھی صنف نسواں کو نظر انداز نہیں کیا۔ بلقیسا، سفیریہ اور روز جیسے نسوانی کردار اس کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔

راشد الخیری کی دلگداز اور جانسوز طبیعت نے معاشرتی اور تاریخی دونوں قسم کے ناولوں میں عجب طرح کا غم و الم پیدا کیا ہے۔ ان کی حزنیہ طبیعت سے بعید تھا کہ واقعہ کربلا انھیں اپنی جانب متوجہ نہ کرے۔ اپنی تاریخی کتاب 'سیدہ کا لال' میں انھوں نے واقعہ کربلا کی مختصر تاریخ لکھی جس میں ناولانہ اسلوب کارفرما ہے تو 'عروس کربلا' جیسا ناول بھی اس سانحہ عظمیٰ پر تحریر کیا۔ راشد الخیری کے تمام تاریخی ناولوں میں سب سے ممتاز 'عروس کربلا' ہے جسے راشد الخیری نے ۱۹۱۹ء میں تحریر کیا۔ اس ناول کی مقبولیت کے باعث ہی معاصرین نے اس طرز کے کئی ناول لکھے لیکن 'عروس کربلا' کے آگے سب ہیچ ہیں۔ مصر کے مسیحی العقیدہ عربی مصنف جرجی زیدان نے مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت پر کئی کتابیں لکھیں۔ ان کتابوں میں مسلمان طرز معاشرت

> ''عروس کربلا ایک دوہرے پلاٹ کا ناول ہے جس میں واقعہ کربلا اور عبید و روز کا قصہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ پھر کوفہ اور کربلا میں یہ دونوں پلاٹ آپس میں مل جاتے ہیں۔ روز عرف کلثوم اپنے چچا اور چچی کے ساتھ کوفہ میں رہتی ہے پھر اپنے پالنے والے ماں باپ پلیٹو اور میرینا کے ساتھ بصرہ میں زندگی گزارتی ہے جس سے امام حسینؑ کی مدینہ سے مکہ اور پھر مکہ سے کوفہ کی طرف ہجرت وغیرہ کے احوال ملتے رہتے ہیں۔ عبید جیسے جوان سے جو کوفہ کا متوطن ہے، اسے مزید حالات سے آگاہی ہوتی رہتی ہے۔ عروس کربلا ایک چست پلاٹ کا ناول ہے جس کے واقعات ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ ناول میں تجسس کی فضا کلثوم کی والدہ مرحومہ کی وصیت کے ذریعہ بنتی ہے جو ناول کے اختتام تک قائم رہتی ہے۔''

کی تعریف کے در پردہ تنقیص بھی کی گئی ہے اور مسلمانوں پر طنز کے تیکھے وار کئے گئے ہیں۔ جرجی زیدان کی کتابوں میں ایک ناول 'غادۃ کربلا' بھی ہے جسے سید ظہور احمد سب ایڈیٹر اخبار ہمدم لکھنؤ نے اردو زبان کا قالب عطا کیا تھا۔ راشد الخیری کا ناول 'عروس کربلا' پلاٹ اور ناول کی خوبیوں کے اعتبار سے جرجی زیدان کے ناول سے بڑھ کر ہے۔ علامہ نے اس ناول میں جرجی زیدان کے اعتراضات کے جوابات بھی جا بجا غیر محسوس طریقے سے دئے ہیں۔ کربلا کا واقعہ تو یونہی دردناک اور غم انگیز ہے، اس پر مصور غم کے خامہ غمناک نے قیامت کا سماں پیدا کر دیا ہے۔ ناول پڑھتے وقت قاری اپنے آنسوؤں کو ضبط نہیں کر پاتا ہے۔ ان کے کئی ناول شرر کی طرح ہی مسلمانوں اور عیسائیوں کی مذہبی کشمکش پر مبنی ہیں لیکن اس کے برخلاف ناول 'عروس کربلا' وفور عقیدت کے زیر اثر شخصی عناد سے شروع ہوتا ہے جو بعد میں قومی عناد کی شکل اختیار کر لیتا ہے جسے تاریخی پشت پناہی حاصل ہے۔ البتہ اس ناول میں بھی مسیحیت کا ایک زاویہ موجود ہے۔ ناول کا پلاٹ چست، گٹھا ہوا اور مسلسل ہے۔ ناول کا آغاز حضرت علیؑ کی شہادت سے ہوتا ہے اور بعد میں کربلا کے خون آشام اور المناک واقعہ کا بیان ہوا ہے۔ تاریخی واقعات کے ساتھ جو قصہ بیان ہوا ہے وہ بہت دلچسپ ہے۔

قصہ کا مرکزی کردار 'روز' نام کی لڑکی ہے جسکا پیدائشی نام کلثوم ہے اور وہ ایک مسلمان والدین کی بیٹی ہے۔ کلثوم کے والدین حضرت علیؑ کے سچے عاشق ہیں۔ امیر معاویہ اور حضرت علیؑ کے درمیان پیدا شدہ تنازعات اور جنگ کے زیر اثر کلثوم کے والدین امیر معاویہ کو قتل کرنے کی کوشش میں زخمی ہو گئے۔ زخمی حالت میں کلثوم کے والد اپنی حاملہ بیوی (جو ابھی کلثوم کے حمل سے ہے) کو لیکر مصر سے کوفہ جانے کی کوشش میں دریا کے کنارے پہونچے۔ وہاں ایک خاتون سخت طوفانی ماحول میں دریا کے سفر کے ذریعہ دمشق کے لئے عازم سفر تھی۔ ان دونوں نے خاتون سے منت وسماجت کر کے کشتی میں سوار ہونے کی اجازت چاہی۔ خاتون نے دونوں زخمیوں کو اپنے ساتھ کشتی میں سوار کر لیا۔ دوران سفر کشتی میں ہی زخمی عورت نے خاتون کو ایک رقعہ دیا کہ جب اس کی اولاد بڑی ہو جائے تو اسے میرا یہ خط دے دینا جسے کل رات میں نے اپنے خون سے تحریر کیا ہے۔ اس کے بعد ہی عورت ایک بچی کو جنم دے کر انتقال کر گئی۔ خاتون وصیت کے بارکی ادائیگی کے تعلق سے پریشان تھی کیونکہ بچی کا باپ بچی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا اور اپنا محل قیام بھی ظاہر کرنے پر راضی نہ تھا۔ تب خاتون نے نشانی کی غرض سے بچی کی پشت پر اپنا نام گود دیا۔

بچی یعنی کلثوم کا باپ بھی کوفہ میں اپنی ننھی بچی کو چھوڑ کر دنیا سے چل بسا اور کلثوم کی پرورش و پرداخت کی ذمہ داری اس کے چچا پر آن پڑی۔ چچا کلثوم سے بہت محبت کرتا تھا لیکن چچی کی آنکھوں کا وہ کانٹا تھی۔ چچی نے اپنے شوہر کو ضد کر کے ایک تجارتی سفر پر بھیج دیا اور پیچھے کلثوم کو ایک اندھے کنوویں میں پھینک کر دوسری جگہ اس کی فرضی قبر بنادی۔ شوہر سفر سے لوٹا تو اس نے کلثوم کے انتقال کا جھوٹا احوال گوش گذار کیا اور خوب نالہ وشیون کیا۔ ادھر ہرقل کا بھتیجا پلیٹو اور اس کی بیوی میرینا کوفہ کے مضافات میں ٹہل رہے تھے کہ انھیں کنوویں میں ایک بچی کے وجود کا علم ہوا۔ لاولد پلیٹو اور میرینا نے اسے اپنی بیٹی کی طرح پالا اور 'روز' نام دیا۔ روز اپنے نئے ماں باپ کی شفقت ومحبت سے سرشار تھی اور وہ دونوں بھی روز کی خوبصورتی و ذہانت سے خوش تھے۔ گو کہ روز جب مسیحی العقیدہ زن و شوہر کی کفالت میں آئی تو صرف دو۔ ڈھائی سال کی تھی لیکن حیرت انگیز طور سے وہ اسلامی عقیدہ پر پختگی سے قائم رہی۔ البتہ ماں باپ کا دل رکھنے کو وہ مسیحی رسومات میں بھی شامل ہوتی تھی تاہم توحید کی راسخ جڑوں کو تثلیث کی تبلیغ سے کوئی فرق نہ پڑا۔ پلیٹو نے روز کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے اسے شہسواری اور تیر اندازی کے فنون اچھی طرح سکھا دئے۔ ایک دن روز کی ملاقات عبید نام کے نوجوان سے ہوئی جو بہادر اور اسلامی حمیت سے سرشار طبیعت کا مالک تھا۔ روز اور عبید میں رفتہ رفتہ قربت بڑھتی گئی۔ عبید کے ذریعہ ہی روز کو معلوم ہوا کہ یزید تخت خلافت پر قابض ہو چکا ہے اور نواسہ رسولؐ امام حسینؑ کو اذیت دے رہا ہے۔ عبید نے بتایا کہ وہ اسی تعلق سے کسی خاص کوشش میں سرگرم ہے۔ ادھر پلیٹو کو روز کے اسلامی عقائد کا علم ہو گیا اور اس نے اسے زندان میں ڈال دیا۔ جب روز کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی تو بریلیو کی سزا جو عیسائیت سے مرتد ہو جانے والوں کو دی جاتی تھی، روز کو دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس موقع پر عبید نے اسے بچالیا۔ دوبارہ زندان میں مقید کی گئی کلثوم کو عبید نقب زنی کر کے آزاد کرا لے گیا۔ پھر یہاں سے کوفہ میں حضرت مسلم کی آمد دکھائی گئی ہے، عبید ان کے مشن میں مدد کرتا ہے۔ حضرت مسلم اور ان کے بچوں کی شہادت کے بعد حارث یعنی قاتل طفلان مسلم کو روز قتل کر ڈالتی ہے۔ اس کا عشق امام یہیں ختم نہیں ہوتا، وہ ابن زیاد کو قتل کرنے کے لئے اسکے محل میں گھس جاتی ہے لیکن گرفتار ہو جاتی ہے۔ اپنے حسن کی بدولت وہ پھر آزاد ہو جاتی ہے اور کربلا میں پیاسوں کی سقائی کی کوشش کرتی ہوئی ابن سعد کے فوجیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتی ہے۔ عمر ابن سعد اسے بھی شہادت حسینؑ کے بعد قیدیوں کے ساتھ کوفہ لے جاتا ہے۔ وہاں ابن سعد اور ابن زیاد میں روز کو حاصل کرنے کے لئے جھگڑا ہوتا ہے اور دونوں یزید سے فیصلہ کروانے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ لیکن شام پہونچنے پر تو یزید خود روز کو اپنے حرم میں داخل کرنے کا حکم دے دیتا ہے۔ یزید کی ماں میسونہ جب روز کو دلھن بناتی ہے تو اسکی پشت پر اپنے ہاتھوں تحریر کردہ نام دیکھ کر اس بچی کو پہچان جاتی ہے اور اسکی ماں کا خط اسے دیتی ہے۔ خط پڑھتے ہی روز کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگتا ہے کیونکہ اسکی ماں نے اپنے قتل کی روداد لکھی تھی کہ کس طرح امیر شام کے فوجیوں نے اس پر ظلم کئے لہٰذا اسکی بیٹی امیر شام کی اولاد سے انتقام لے۔ اسی بیچ عبید بھی وہاں پہونچ جاتا ہے۔ دونوں مل کر یزید کا کام تمام کر دیتے ہیں۔ عبید اور روز (کلثوم) کے نکاح پر ناول اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔

اگر چہ قصہ کے ہمراہ کربلا کا دردانگیز واقعہ بیان ہوا ہے لیکن قصہ کے اختتام نے وہ اثر انگیزی قائم نہیں رکھی جو کربلا جیسے سانحہ کے المناک بیان کے بعد ہونی چاہئے تھی۔ عبید اور روز کے وصل سے فضا یکسر تبدیل ہو جاتی ہے۔ اگر راشد الخیری کسی ایک کی یا ہیرو اور ہیروئن دونوں کی موت پر اختتام کرتے تو ناول کی المناک فضا آخر تک قائم رہتی اور قارئین پر دیر پا تاثر قایم ہوتا۔ راشد الخیری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے معاشرتی و اصلاحی ناول لکھتے لکھتے تاریخی ناول کی طرف توجہ مبذول تو کی لیکن انھیں عبد الحلیم شرر کی طرح تاریخی شعور حاصل نہیں ہے۔ ناول 'عروس کربلا' کے مطالعہ سے یہ قول سچا ثابت ہوتا ہے۔ واقعہ کربلا تاریخی حیثیت کا حامل اہم ترین واقعہ ہے لیکن انھوں نے اس واقعہ کے ساتھ عبید اور روز کی داستان محبت بھی جوڑ دی۔ اگر یہ رومانوی کہانی شہادت امام حسینؑ کے عہد میں اور معاصر حالات کے سائے میں بیان ہوتی تو کچھ مضائقہ نہ تھا لیکن یہ رومانوی قصہ تو کربلا کے واقعات میں داخل ہو جاتا ہے۔ جیسے عبید کوفہ میں مسلم ابن عقیل کے ہمراہ دکھایا گیا ہے۔ روز حضرت مسلم کے بیٹوں کے قاتل حارث کو قتل کر دیتی ہے نیز ابن زیاد پر کوفہ میں، ابن سعد پر کربلا میں اور پھر یزید پر دمشق میں حملہ کرتی ہے۔ اس طرح کے قصوں کی کربلا کے تاریخی

واقعات میں کوئی جگہ نہیں بنتی بلکہ یہ دخالت تاریخی واقعیت کو متاثر کرتی ہے۔اسکے بجائے اگر راشد الخیری ایک دوہرے پلاٹ کا ناول اس طرح لکھتے جس میں واقعہ کربلا علاحدہ بیان ہوتا اور مخصوص معاصر فضا میں یہ داستان عشق علاحدہ بیان ہوتی اور عشقیہ کرداروں تک کربلا کے حالات کی اطلاع رسانی ہوتی اور ان کے ردعمل کا حال قلمبند کیا جاتا تو تاریخی حقیقت کے ساتھ انصاف بھی ہوتا اور یہ عشقیہ قصہ بھی مکمل ہو جاتا۔

عروس کربلا ایک دوہرے پلاٹ کا ناول ہے جس میں واقعہ کربلا اور عبید و روز کا قصہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ پھر کوفہ اور کربلا میں یہ دونوں پلاٹ آپس میں مل جاتے ہیں۔روز عرف کلثوم اپنے چچا اور چچی کے ساتھ کوفہ میں رہتی ہے پھر اپنے پالنے والے ماں باپ پلیٹو اور میرینا کے ساتھ بصرہ میں زندگی گزارتی ہے جس سے امام حسینؑ کی مدینہ سے مکہ اور پھر مکہ سے کوفہ کی طرف ہجرت وغیرہ کے احوال ملتے رہتے ہیں۔عبید جیسے جوان سے جو کوفہ کا متوطن ہے، اسے مزید حالات سے آگاہی ہوتی رہتی ہے۔عروس کربلا ایک چست پلاٹ کا ناول ہے جس کے واقعات ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ناول میں تجسس کی فضا کلثوم کی والدہ مرحومہ کی وصیت کے ذریعہ بنتی ہے جو ناول کے اختتام تک قائم رہتی ہے۔ناول کے شروع میں یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ کلثوم کی ماں اپنی وصیت پر مشتمل خط جسکے حوالے کر رہی ہے، یزید کی ماں میسونہ ہی ہے۔ناول کے آخر میں میسونہ روز عرف کلثوم کی پشت پر اپنے ہاتھ سے گودا ہوا اپنا نام دیکھتی ہے اور ناول کا یہ سسپنس اپنے اختتام کو پہونچتا ہے۔کلثوم کی چچی مغیرہ کے ذریعہ ننھی کلثوم کو کنوویں میں پھینکنا، فرضی قبر تیار کرنا اور اپنے شوہر خالد کی سفر سے واپسی پر بین و بکا یہ سب تجسس کی فضا تیار کرنے میں مدد کرتے ہیں۔قاری کے ذہن میں یہ تجسس برقرار رہتا ہے کہ کیا خالد پر فرضی قبر کا راز منکشف ہو پائے گا؟ کیا خالد کبھی اپنی بھتیجی کلثوم سے دوبارہ مل پائے گا؟ کہیں کہیں کچھ واقعات سے پلاٹ کی چستی اور گٹھیلا پن متاثر بھی ہوتا ہے۔جب روز کے بریلیو کی ساری تیاریاں ہو جاتی ہیں اور راہب روز کو کڑاہو میں پھینکنے کا اشارہ بھی کر دیتا ہے، عین اسی لمحے عبید کا وہاں پہونچنا، راہب کی گردن پر تلوار رکھنا اور عیسائیوں کے مجمع میں ایک مسلم نوجوان کا ان کے عقیدہ کے برخلاف اپنی بات منوا کر بریلیو کو رکوانا عقل و منطق کے بالکل خلاف اور غیر فطری معلوم ہوتا ہے۔شاید راشد الخیری کو بھی اس منطقی سبکی کا احساس ہو رہا تھا جبھی وہ ایک مہمل استدلال قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔۔

> ”حکومت کی طاقت بھی ایک عجیب چیز ہوتی ہے۔سیکڑوں مسلح عیسائیوں کے سامنے ایک مسلمان شیر کی طرح دہاڑ رہا تھا اور سب بھیگی بلی بنے کھڑے تھے۔“

کردار نگاری کے حوالے سے عروس کربلا ایک زندہ اور جاندار ناول ہے۔ناول کے سبھی کرداروں پر راشد الخیری نے محنت کی ہے اور تمام کردار اپنی خصوصیات اور نفسیاتی پیچیدگیوں کے ساتھ اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔نسوانی کرداروں پر راشد الخیری زیادہ توجہ دیتے ہیں اسلئے روز کا کردار پورے ناول پر چھایا ہوا ہے۔اسکے علاوہ میرینا اور میسونہ کے کردار بھی اپنی جانب کھینچتے ہیں۔علامہ کے متعلق یہ شہرہ کہ وہ فقط عورتوں کے آنسو پونچھتے نظر آتے ہیں، یہاں دم توڑتا دکھائی دیتا ہے۔ناول میں مرکزی نسوانی کردار یعنی روز اپنی فعالیت، پختگی اور گوناگوں کمالات کے باعث راشد الخیری کے تخلیق کردہ زندہ جاوید کرداروں میں شمار کرنے کے قابل ہے۔بلکہ راشد الخیری کے تراشیدہ سفیریہ اور بلقیسا جیسے نسوانی کرداروں سے بھی روز کا کردار آگے بڑھ جاتا ہے۔روز کی طرح اسکے عاشق عبید کا کردار بھی ایک عاشق صادق اور سچے مسلمان کا کردار ہے۔روز کی طرح وہ بھی امام حسینؑ سے گہری عقیدت رکھتا ہے۔بریلیو کو انے کے موقع پر وہ اپنا تعارف اس انداز سے کراتا ہے۔۔۔

> ”راہب۔آپ کا نام؟
> شخص۔عبید
> راہب۔کچھ اور پتہ دیجئے۔
> شخص۔امام حسین علیہ السلام کا ادنیٰ خادم۔“

یزید کی کردار نگاری قدرے مفصل اور کامیاب ہوئی ہے۔وہ شراب کا دلدادہ اور حسن کا پجاری ہے۔صبح سے شام تک شراب نوشی اور شام تا صبح زنا کے فعل قبیح میں غرق رہتا ہے۔شہر کی کتنی ہی معصوم لڑکیاں اس کی ہوس کا شکار ہو جاتی ہیں۔یزید کے اطراف ایمان فروش مصاحبوں کا ہجوم رہتا ہے جو اس کی خوشامد میں شب و روز سرگرم رہتے ہیں۔اس کے ندیم اس کی خوشنودی کی خاطر دین و شریعت کی ہتک اور بزرگان دین کی توہین سے بھی دریغ نہیں کرتے۔یزید کا درباری قاضی عمیر بھی اس کی منشا کے مطابق فتویٰ صادر کرتا ہے۔چنانچہ جب سعدہ نامی دوشیزہ کو وہ جبراً اپنے حرم میں داخل کرنا چاہتا ہے اور سعدہ کا ضعیف العمر باپ راضی نہیں ہوتا تو قاضی عمیر کے فتوے پر اسے قتل کر دیا جاتا ہے اور سعدہ کو زبردستی حرم میں داخل کیا جاتا ہے۔یزید خوبصورت عورتوں کا ایسا رسیا ہے کہ سیاسی معاملات پر بھی انھیں تفوق دیتا ہے۔چنانچہ جب قاضی عمیر مسلم بن عقیل کے قتل کی خبر دیتا ہے تو یزید پوچھتا ہے کہ پہلے یہ بتاؤ کہ سعدہ اور اس کا باپ اب تک گرفتار کیوں نہیں ہوئے۔سعدہ کو داخل حرم کر کے ہی وہ سیاسی پیش رفت سننا پسند کرتا ہے۔

> ”یزید نے گردن کا اشارہ کیا اور بڈھے کی گردن جلاد کے پہلے ہی وار میں سعدہ کے سامنے زمین پر تڑپنے لگی۔اب یزید مسکرایا اور کہا ہاں اس لڑکی کو خوابگاہ میں داخل کرو اور اب کہو کیا ہوا مسلم قتل ہو گیا؟
> عمیر۔جی ہاں
> یزید۔اور حسینؑ
> عمیر۔کوشش ہو رہی ہے، کوفہ پہونچنے کی دیر ہے۔
> یزید۔جلدی کرو اور عبداللہ کو لکھ دو کی حسینؑ کا سر ہماری خدمت میں بھیج دے۔“

ناول کی مکالمہ نگاری میں بھی راشد الخیری کو کامیابی ملی ہے۔مکالموں کے فقرے برجستہ، چست اور حسب حال ہیں۔فقرے مختصر ہیں جس سے تفہیم و ترسیل کا معاملہ بآسانی طے ہو پاتا ہے۔کہیں کہیں جیسے روز اور پلیٹو کے مکالمات میں جہاں اسلام اور مسیحی ادیان کی بحثیں پائی جاتی ہیں، وہاں مکالمے کچھ طویل ہوئے ہیں۔مکالمے کرداروں کی نفسیات کو بخوبی منعکس کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔منفی کرداروں کی بے دینی، شقی القلبی اور نفاق انکی گفتگو سے جھلکتے ہیں۔ابن زیاد سے یزیدی لشکر کے ملاعین کے مکالمے کا یہ انداز ملاحظہ ہو۔۔

> ”عبداللہ۔مجھے ڈر ہے کہیں رسالت کا خیال تمھاری ہمت نہ پست کر دے۔
> شمر۔توبہ توبہ ہم ایسے بیوقوف نہیں۔
> ابن سعد۔ایسے خوش اعتقاد مر چکے۔
> خولی۔کبھی بھول کر بھی ہم ایسا وہم دل میں نہ لائیں۔“

منظر نگاری میں بھی راشد الخیری کا قلم تخیل رواں دواں ہے۔میدان جنگ کا منظر تو اس اعتبار سے انھوں نے نہیں پیش کیا کہ آنکھوں کے آگے مصور ہو جائے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے ناول میں یہ پہلو مجمل بیان ہی ہوا ہے۔دربار ابن زیاد اور دربار یزید کی عمدہ منظر کشی کے نمونے اس ناول میں ملتے ہیں۔جس سے ان ظالموں کا ظاہری جاہ و جلال ،ظلم وستم ،عیاشی ،اوباشی کے تمام معاملات واضح ہو کر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتے ہیں۔ سردست دربار یزید کی سرگرمیاں ملاحظہ ہوں۔۔

''دربار یزید گرم ہے گل اندام لڑکیاں آراستہ و پیراستہ حسن عرب کے انواع واقسام کے نمونے دکھا رہی ہیں۔شراب کا دور چل رہا ہے اور چاروں طرف امراءِ دربار ہشاش بشاش قہقہے لگا رہے ہیں۔مغیرہ دمشق کی مشہور مغنیہ اپنا سرود ہاتھ میں لئے خاموش بیٹھی تھی کہ یزید نے گردن سے اشارہ کیا۔مغیرہ نے اپنا ساز درست کیا۔غلام نے جام پیش کئے اور دور چلا۔مغیرہ نے یزید کی تعریف میں چند اشعار گائے عمیر بن اسد ندیم خاص نے بادشاہ کی تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملائے۔حسین لونڈیوں نے حسنکی ،شعرا نے کرم کی اور شجاعانِ میدان نے سپہ گری کی تعریفیں شروع کیں۔''

مجموعی طور پر عروس کربلا راشد الخیری کی تخلیقی صلاحیتوں کا مظہر اور آئینہ دار ہے۔اس میں تاریخی شعور، سیاسی بصیرت، رومانیت، مکالمہ، زبان و بیان اور مخصوص عہد کی فضا سازی کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔اس ناول کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ واقعہ کربلا کو بنیاد بنا کر لکھا گیا یہ پہلا ناول ہے۔راشد الخیری کے پیش روؤں اور معاصرین نے عرائی ثقافت کو سماجی پس منظر میں اپنے ناولوں کا حصہ تو بنایا لیکن واقعہ کربلا کو ناول میں شکل میں پیش نہیں کیا۔راشد الخیری کے ناول میں یہ خامی در آئی ہے کہ انھوں نے روز اور عبید کے معاشقہ کو مرکزی طور پر پیش کیا ہے جس کے لئے واقعہ کربلا نے ایک فریم یا چوکھٹے کا کام کیا ہے جس سے صداقت اور واقعیت مجروح ہوئی ہے۔ لیکن قارئین جو تاریخ سے آشنائی رکھتے ہیں انکے لئے خلط افسانہ و تاریخ کی گنجائش نہیں ہے۔لیکن واقعہ کربلا چونکہ ایک حساس واقعہ ہے جسکی ثقافتی اہمیت کے ساتھ مذہبی اہمیت بھی ہے اسلئے یہ تبدیلی و توسیع کچھ کھٹکتی ضرور ہے۔

حوالہ جات

۱۔پروفیسر وقار عظیم ،علامہ راشد الخیری ،اردو اکادمی دہلی ،۲۰۰۹ئ
۲۔ڈاکٹر نجیب اختر ،علامہ راشد الخیری ،محبوب المطابع برقی پریس دہلی ،۱۹۴۵ئ
۳۔راشد الخیری ،سیدہ کا لال ،نعمانی آفسٹ پریس دہلی ،۱۹۳۲ئ
۴۔راشد الخیری ،عروس کربلا ،صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی پنجاب ،۱۹۲۴ئ
۵۔نجم السحر اعظمی ،علامہ راشد الخیری شخصیت اور ادبی خدمات ،کلر پریس دہلی ،۲۰۰۰ئ

❑❑❑

غزل

مرا دکھ بانٹنے کو کوئی بھی شانہ نہ مل پایا
میں زندہ لاش ہوں جس کو کہ دفنانا نہ مل پایا

عبث ہے ایک دن میں لاکھ روپیے کی کمائی بھی
جو شب میں ماں کے ہاتھوں کا بنا کھانا نہ مل پایا

جو دیکھا مڑ کے میں نے کس نے مارا پیٹھ پہ خنجر
سبھی اپنے تھے پیچھے کوئی بے گانہ نہ مل پایا

گئے تھے اس کے کوچے میں وفا کے پھول چننے کو
فقط کانٹے ملے ہم کو گل رعنا نہ مل پایا

بھٹکتی پھر رہی ہے آگ بن کر آرزو میری
وفا کی اس تپش کو کوئی پروانہ نہ مل پایا

گواہی دے رہے ہیں قیس اور بہزاد بھی پیہم
کہ اے مشہود تیرے جیسا دیوانہ نہ مل پایا

محمد مشہود علی
ریسرچ اسکالر بنارس ہندو یونی ورسٹی
7275549890

محمد فرید
ہتھگام، ضلع فتح پور، اتر پردیش
78603702429

ناول بستی کا نو آبادیاتی جائزہ

نو آبادیات (Colonialism) جدید انسانی تاریخ کا وہ تلخ باب ہے جس نے نہ صرف زمینوں کی سرحدیں بدلی ہیں بلکہ انسان کے شعور، تہذیب اور شناخت کو بھی گہرے طور پر متاثر کیا ہے۔ لفظ آبادی (Colony) کے لغوی معنی نئی آبادی یا نئی بستی کے ہیں، مگر اس کے باطن میں اقتدار، غلبہ اور استحصال کی ایک پوری تاریخ پوشیدہ ہے۔ یہ اصطلاح لاطینی لفظ Colonial سے نکلی ہے، جس کا مفہوم کسی دوسرے خطے پر قبضہ کر کے وہاں اپنی سیاسی، معاشی اور تہذیبی بالادستی قائم کرنا ہے۔ ناصر عباس نیر نو آبادیات کی معنوی حدود متعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''انسانوں کے مخصوص گروہ کے ہاتھوں مخصوص مقاصد کی خاطر برپا ہونے والی صورتحال ہے۔''[1]

اس اصطلاح کو سب سے پہلے رومیوں نے استعمال کیا جب وہ کسی علاقے پر قبضہ کرتے تو اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے اپنے افراد پر مشتمل نئی آبادیاں قائم کر لیتے تھے۔ آج کل یہ اصطلاح غیر ملکی اقتدار و تسلط کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ انیسویں صدی اور یورپی اقوام نے امریکہ، اسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جزیرۂ عرب الہند کی طرح ایفرو ایشیائی ممالک پر بھی اپنا تسلط جمایا تاہم اول الذکر ممالک کے برعکس انہوں نے اپنی نو آبادیات میں بسا نہیں سکتے بلکہ کچھ مقامی سیاح بنا کر بیس کروڑ لوگوں کو اپنا غلام بنائے رکھا۔

نو آبادیاتی نظام اپنی توجیہ کے لیے ایک مخصوص فکری منطق تشکیل دیتا ہے، جس کے تحت استعمار خود کو تہذیبی و اخلاقی طور پر برتر اور مفتوح اقوام کو پسماندہ قرار دیتا ہے۔ اسی تصور کے ذریعے مقامی سماج میں یہ تاثر راسخ کیا جاتا ہے کہ نو آبادیاتی اقتدار ترقی اور اصلاح کا ضامن ہے، حالانکہ اس کے پس پشت معاشی استحصال اور تہذیبی انکار کارفرما ہوتا ہے۔ نتیجتاً مفتوح قوم رفتہ رفتہ اپنی اقدار، روایت اور شناخت کو کمتر سمجھنے لگتی ہے، جو نو آبادیاتی شعور کی سب سے گہری اور دیرپا شکل ہے۔

اردو ناول کا آغاز چونکہ نو آبادیاتی عہد میں ہوا، اس لیے اس کی تشکیل اور ارتقا میں سیاسی اور سماجی حالات کا گہرا دخل رہا ہے۔ نو آبادیاتی نظام کے زیرِ اثر اردو ناول میں حاکم اور محکوم کے درمیان پیدا ہونے والی نفسیاتی کشمکش نمایاں ہو جاتی ہے، جس کے نتیجے میں شناخت، احساسِ محرومی اور تہذیبی زوال جیسے موضوعات مرکزی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اسی پس منظر میں اردو ناول محض سماجی حقیقت نگاری نہیں رہتا بلکہ اقتدار اور محکومی کے باہمی تعلق کو فکری سطح پر منکشف کرتا ہے۔ نو آبادیاتی نظام میں مسلم امہ کی صورتحال کے بارے میں ریاض ہمدانی لکھتے ہیں:

> ''عام ہندوستانی خصوصاً مسلمانوں میں احساسِ محرومی بڑھ گیا فارسی اب ریاستی اور دفتری زبان نہ رہی۔ فارسی زبان کی حاکمیت ختم ہوئی تو نئے حاکموں کی زبان سے دوری نے مسلمان حاکمین کا لسانی تفاخر اور احساس برتری ختم کیا۔ حکمران آج کے سپاہی بن رہے تھے وہ بھی ایک غیر ملک کی طاقت کے، جنہوں نے بے روزگاری کو بڑھا دیا تھا۔''[2]

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی میں نو آبادکار اور مزاحمتی بیانیہ کے تحت بیانیہ کے ایسے عناصر کو اہم جانا گیا جو اپنی زبان و تہذیب کو اپنا سمجھتا ہے اور پھر اس کا اظہار کرتا ہے۔ ناصر عباس نیر کے ہاں افسانہ اور ناول دونوں میں متبادل بیانیے کی تلاش کی گئی ہے۔ منٹو اور انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر کے ناول آگ کا دریا پر خصوصی توجہ کی گئی ہے۔ نو آبادیاتی تنقید اردو ادب کا ایک نیا موڑ ہے۔ ہمارے ناقدین اس پہلو کو بروئے کار لاتے ہوئے فن پاروں کے ایسے نئے گوشے متعارف کروا

> ''بستی کا موضوع تقسیم ہند کے نتیجے میں مہاجرین کے المناک مسائل ہیں۔ فرقہ وارانہ اور فسادات کے نتیجے میں جبری ہجرت تہذیبی سطح پر نا قابل فراموش المیہ بن گئی۔ انتظار حسین نے اس ناول میں استعاروں اور اشاروں کنایوں میں نا قابل فراموش اسلامی تاریخی، اساطیری اور دیومالائی قصوں کو علامتی رنگ میں پیش کیا ہے۔ کھوئے ہوؤں کی جستجو میں انھوں نے حال اور مستقبل کے انسان کے عرفان کو اپنی ذات کے تناظر میں پیش کیا ہے۔ ناول کا آغاز ہابیل اور قابیل کے علامتی قصے سے ہوتا ہے۔ آدم کے ان دونوں بیٹوں کے مابین ہونے والی جنگ پہلے قتل کا سبب بنی۔ اس کے بعد انسانی قتل کا سلسلہ چل نکلا۔ قتل و غارت گری کی جو المیہ داستان تقسیم ہند کے واقعہ کے بعد نسل در نسل منتقل ہوئی اس کا تعلق ہابیل اور قابیل کے ساتھ جوڑنا انتظار حسین کی قصہ گوئی کی مہارت کا ثبوت ہے۔''

رہے ہیں جو ہمارے ہاں پہلے بروئے کار نہیں لائے گئے۔گویا یہ رجحان ہمارے ناقدین کے تنقیدی شعور کے ساتھ ساتھ ان کی تاریخی وسماجی اور سیاسی آگاہی کو بھی آشکار کرتا ہے۔

نو آبادیاتی تخیل چونکہ قدیم اور جدید مغربیت، وجودیت، توہم و تعقل، تخیل اور حقیقت کی نو آبادیاتی جبری تفریق سے آزادی حاصل کرتا ہے۔اس لیے اسے فکشن کی نئی ہیتوں کی مدد سے قدیم داستانوی ماضی کو پانے میں کسی تعجب کا احساس نہیں ہوتا۔جسے نئی مخلوط کثیر جذبی صورتحال کی نمائندگی کے لیے قبل نو آبادیاتی عہد کا داستانوی فکشن سے جوڑنے میں کوئی حیرت نہیں ہوتی۔نو آبادیاتی عہد کے ناول نگار وہ حقیقت بیان کرتا ہے جو عقل کے خلاف نہیں لیکن اس سے مختلف ہوتی ہے۔نو آبادیاتی فکشن میں نو آبادکار کے گہرے اثرات ملتے ہیں۔لیکن یہی نو آبادیات میں تخلیق کار اپنے ماضی اور تہذیب کا احیاء کرتے ہیں۔یعنی مابعد نو آبادیات میں نظر انداز اور رد کی گئی تہذیب کی دوبارہ سے تشکیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس حوالے سے ناصر عباس نیر لکھتے ہیں:

> ''ناول کی ہیئت میں متبادل بیانیہ پیش کرنا ایک سادہ سی بات نہیں ہے اصل یہ ہے کہ یہی نو آبادیاتی بیانیے اور ناول کے ہیئت میں داخلی سطح کی ہم آہنگی نہیں ہے یہیں نو آبادیاتی فکشن ہم آہنگی کی تلاش سے زیادہ اس پوری ہیت میں مداخلت کرتا ہے اور اسے الٹتا پلٹتا ہے جو خود کو 'برتر غیر' کے طور پر پیش کرتی ہے۔سرسری نظر میں ہم اسے ایک اجنبی صنف کو دیسی بنانے کا عمل کہہ سکتے ہیں''۳؎

یہاں یہ سوال جنم لیتا ہے کہ نو آبادیاتی عہد میں آزادی یا خود مختاری کی حقیقی صورتحال کیا ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا واقعی آزادی کے بعد ہم تو آبادکاروں سے بالکل بے نیازانہ اپنے رستے متعین کر سکتے ہیں۔نظام تو آبادی کے لیے لے کر جاتے ہیں اور اس نظام کے اس کا جواب اتنا سادہ نہیں کہ ہاں یا نہیں کی صورت میں دیا جائے نو آبادیاتی نظام اس طرز پر واضح ہوا ہوتا ہے جو اقتصادی طور پر آزادی کو مجبور کر دیتا ہے۔جس کے نتیجے میں آزادی کے بعد بھی نو زائیدہ مملکت کو اپنی ہار کے لیے ان کا سہارا لینا پڑتا ہے۔اس میں نو آبادکار کی چال چلن کو اس طرح واضح کرتے ہیں کہ اب ایسی صورتحال میں ملک کو آزاد کیا جائے تو آزادی کا مقدس دیوتا آزادی کی لعنت میں بدل جاتا ہے اور استعماری قوت اپنی تمام تر استبدادی طاقت کے ساتھ قوم کو مراجعت پر مجبور کر دیتی ہے۔استعماری قوت واضح لفظوں میں یہ کہتی ہے ''تم آزادی چاہتے ہو اور اب بھوک سے مرو۔''

یہی صورت حال ہمیں انتظار حسین کے ناول بستی میں بھی نظر آتی ہے جو اپنی سرزمین سے بچھڑنے اور انگریزی حاکمیت اور ہجرت کا المیہ ہے۔صدیوں ایک سرزمین پر رہنے والوں سے جب ان کی زمین اور چھت چھین لی جائے اور اس ہجرت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال نئی آبادکاری کا دکھ بستی میں نظر آتا ہے۔

بستی کا موضوع تقسیم ہند کے نتیجے میں مہاجرین کے المناک مسائل ہیں۔فرقہ وارانہ اور فسادات کے نتیجے میں جبری ہجرت تہذیبی سطح پر ناقابل فراموش المیہ بن گئی۔انتظار حسین نے اس ناول میں استعاروں اور اشاروں کنایوں میں ناقابل فراموش اسلامی تاریخی، اساطیری اور دیومالائی قصوں کو علامتی رنگ میں پیش کیا ہے۔کھوئے ہوؤں کی جستجو میں انھوں نے حال اور مستقبل کے انسان کے عرفان کو اپنی ذات کے تناظر میں پیش کیا ہے۔

ناول کا آغاز ہابیل اور قابیل کے علامتی قصے سے ہوتا ہے۔آدم کے ان دونوں بیٹوں کے مابین ہونے والی جنگ پہلے قتل کا سبب بنی۔اس کے بعد انسانی قتل کا سلسلہ چل نکلا۔قتل وغارت گری کی جو المیہ داستان تقسیم ہند کے واقعہ کے بعد نسل در نسل منتقل ہوئی اس کا تعلق ہابیل اور قابیل کے ساتھ جوڑنا انتظار حسین کی قصہ گوئی کی مہارت کا ثبوت ہے۔قتل وغارت گری کی علامت تقسیم ہند ہے جسے انھوں نے ناول کے مرکزی کردار ذاکر اور اس کے کنبے کے حوالے سے پیش کیا ہے۔تقسیم کے بعد اس کنبے کا انتشار پیش کیا گیا ہے۔ذاکر کی خالہ زاد بہن صابرہ ہندوستان میں رہ جاتی ہے جب کہ طاہرہ شوہر کے مشرقی پاکستان میں ملازم ہونے کے باعث وہیں منتقل ہو جاتی ہے۔ذاکر اپنے والدین کو لے کر مغربی پاکستان میں جا بستا ہے۔لیکن یہاں سکوں ناپید ہے قدرت کے کارخانے کے مصداق یہاں بھی تقسیم عمل میں آتی ہے۔آزاد وطن دولخت ہو کر بنگلہ دیش اور پاکستان میں تقسیم ہو جاتا ہے۔یوں تقسیم در تقسیم کا یہ عمل ایک خاندان کو تین ملکوں میں آباد ہونے پر مجبور کر دیتا ہے۔کنبے کے لوگ تینوں ملکوں میں امن کے خواہاں ہیں۔۱۹۶۵ کی جنگ کے باعث ذاکر کا کنبہ بے سکونی کی تفسیر بن جاتا ہے۔انتظار حسین نے ہجرت کے کرب کو ایک ناظر کی حیثیت سے دیکھا اور ایک نو آبادکار کی حیثیت سے محسوس کیا تھا۔اس لئے انھوں نے نو آبادکاروں کے اقتصادی اور ثقافتی مسائل کا تجزیہ سائنسی انداز میں کیا ہے۔انتظار حسین نے ناول کے علامتی انداز کو برقرار رکھنے کے لیے عہد نامہ قدیم، انجیل، قصص الانبیاء، دیومالا، بودھ جاتکوں، پرانوں، داستانوں اور صوفیا کے ملفوظات کے مطالعے سے ایسا جاندار اسلوب تخلیق کیا ہے جو صرف انھیں سے مخصوص ہے اس کی تہہ داری میں علامتوں کے انبار ہیں اور اس کی سادگی میں فریب نظر کا التباس پیدا ہوتا ہے۔اقتباس:

> ''کھٹ بڑھیا اڑتے اڑتے اونچے نیم پہ اترتی تو دکھائی دیتا کہ وہ ملکہ سبا کے محل میں خط چھوڑ کے آرہی ہے اور حضرت سلیمان کے قلعے کی طرف جا رہی ہے اور جب گلہری منڈیر پر دوڑتے دوڑتے اچانک دم پر کھڑی ہو کے چک چک کرتی تو وہ اسے تکنے لگتا اور حیرت سے سوچتا کہ اس کی پیٹھ پر پڑی یہ کالی دھاریاں رام چندر جی کی انگلیوں کے نشان ہیں۔''۴؎

انتظار حسین نے 'بستی' کی صورت میں تہذیبی روایات کی بازیافت کی کوشش کی ہے۔یہ قصہ ان لوگوں کی بازیافت ہے جو وقت کی آندھی میں بچھڑ جاتے ہیں۔یادداشت کے بل پر بھولے بسرے لوگوں کو قرطاس پر منتقل کرنے سے ایک گم شدہ دنیا اپنے پورے خدوخال کے ساتھ قاری کے سامنے آجاتی ہے۔اس کے باعث گم شدہ مقامات اور رشتوں کی کسک کو روپ نگر کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔

> ''جیسے اس کا بچپن روپ نگر میں رہ گیا تھا۔روپ نگر میں کیا کچھ رہ گیا تھا۔کچے پکے رستے جو جانے کہاں جا کر رکتے تھے، بس درختوں میں گم ہوتے دکھائی دیتے تھے، ڈولتے ہچکولے کھاتے اکے، اونگھتی رینگتی بیل گاڑیاں، کوئی کوئی رتھ کہ اس میں جتے توانا بیلوں کی گردنوں میں آویزاں گھنٹیوں اور گھنگھروؤں کی بہ دولت وہ مٹی میں اٹے رستے ایک میٹھے شور سے بھر جاتے۔کالا مندر، کالے مندر کے

احاطے میں کھڑا بندروں سے آباد پڑا پیپل، کربلا کی ویران اور اداس
فصیل، ٹیلے والا قلعہ، راون بن، راون بن کے بیچ کھڑا بھید بھرا برگد،
بس ایک پورا دیومالائی عہد تھا جو روپ نگر کے ساتھ رہ گیا تھا۔ ۵

انتظار حسین نے بستی میں قدیم اساطیر کے آئینے میں نسل در نسل یادوں کو کریدا ہے اور پھر اسے زمانہ حال کے کرداروں کے توسط سے قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اس طرح وہ روایت کا احیاء کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کا روایت پر زور دینا ناسٹلجیائی رویہ نہیں ہے بلکہ وہ روایت کے بطن سے مستقبل کی تعمیر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس طرح انھیں حال کا آشوب ماضی کے آشوب سے آمیز دکھائی دیتا ہے۔ کالے مندر سے کربلا تک، کربلا سے قلعے تک، قلعے سے راون بن تک، سب کچھ اسی طرح تھا۔ ۶

بستی میں انتظار حسین نے خارجی رشتوں کی بجائے باطنی رشتوں کو ٹٹولا ہے۔ یہ باطنی رشتے ماضی سے پیوست ہیں انھیں اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ ان کی ذات کا کوئی حصہ کٹ کر ماضی میں کھو گیا ہے۔ انھوں نے اس کھوئی ہوئی ذات کو تخیل کی آنکھ سے علامتی انداز میں واپس اسی ذات میں سمونے کی کوشش کی ہے، جس سے اس کا تعلق ٹوٹا تھا۔ یہ تعلق ہجرت کے باعث ٹوٹا تھا اس لئے ماضی کے اس حصے کو انھوں نے داستانوی اسلوب میں کھوجنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا یہ داستانوی اسلوب، اساطیر، دیومالاؤں اور علامتوں سے مزین ہے۔ اس حوالے سے وہ عام فہم علامتیں اور کنائے استعمال کرتے ہیں جو قاری کے لئے عام فہم بھی ہیں اور اسلوبیاتی اعتبار سے جان دار بھی۔

"میں جب گھر سے چلا تھا تو میرے سارے بال سیاہ تھے۔ اس وقت میری عمر ہی کیا تھی؟ بیس اکیس کے پیٹے میں تھا۔ جب پاکستان پہنچا اور نہانے کے بعد آئینہ دیکھا تو میرے سر کے سارے بال سفید ہو چکے تھے۔ یہ پاکستان میں میرا پہلا دن تھا۔ گھر سے کالے بالوں اور خاندان والوں کے ساتھ نکلا تھا، پاکستان پہنچا تو میرا سر سفید تھا اور میں اکیلا تھا۔" ۷

مذکورہ بالا اقتباس میں سیاہ بالوں کا سفید ہونا اور خاندان والوں کے ساتھ نکل کر پاکستان اکیلے پہنچنا نو آبادکار کے مصائب کی علامتیں ہیں۔ جن میں اسے اپنے اہل خانہ سے ہاتھ دھونا پڑا۔

"مولوی دیا سلائی؟ وہ کہاں کا رہنے والا تھا؟ نہ کسی سے بولنا نہ بات کرتا، اپنے آپ میں گم اور ان ماچس کی ڈبیوں میں جو خالی ادھ کھلی سامنے بچھی بساط پر پڑی رہتیں۔ مولوی دیا سلائی، یہ ڈبیاں کیسی ہیں۔ بابو جی یہ بستیاں ہیں مولوی دیا سلائی! ان میں تیلیاں تو ہیں ہی نہیں، سب خالی ہیں۔ بابو بستیاں خالی ہو گئیں۔" ۸

اس اقتباس میں ماچس کی ڈبیاں بستیوں کی علامت ہیں اور ان میں تیلیوں کا موجود نہ ہونا بستیوں سے مکینوں کے انخلا کی علامت ہے۔ مولوی دیا سلائی کے نام میں بڑی گہری رمز ہے۔ دیا سلائی جل کر بجھ جاتی ہے۔ مولوی بھی خاموش اور اپنے آپ میں گم ہے۔ وہ ماچس کی خالی ڈبیاں اپنے سامنے رکھ کر ان بستیوں کی بازیافت کی کوشش کرتا ہے جو ماچس کی طرح جل گئیں اور ان کے مکینوں کو ماچس کی تیلیوں کی طرح جلا دیا گیا۔ اس طرح انتظار حسین نے ۱۹۶۵ کی جنگ کے بلیک آؤٹ کو افراد کے اعصاب پر سوار ہوتے ہوئے دکھایا ہے۔

بستی کے نمایاں کرداروں میں ذاکر سریندر، سلامت، افضال، صابرہ اور انیسہ شامل ہیں، جو پاک ٹی ہاؤس یا اس کی طرز جیسے چائے خانے شیزان میں مستقل بیٹھتے ہیں۔ یہ بھی کردار متوسط طبقے کے حساس نوجوانوں کے نمائندے ہیں۔ اپنی پراگندگی اور تذبذب کی کیفیت میں مبتلا ہونے کے باعث وہ کسی حتمی فیصلے پر نہیں پہنچتے ہیں۔ ان کے افعال و اعمال فلسفیانہ پیچیدگیوں کے مظہر ہیں۔ ناول میں تقسیم پاکستان کے بعد نو آبادکاروں کے لئے جذبہ محبت لئے ہوئے ہوتا ہے۔ جو بہ تدریج حرص و ہوس اور نفرت کی نذر ہو جاتا ہے۔ ناول کا آغاز علامتی ہے جو بہ تدریج صورت واقعہ کی مناسبت سے جدید دور کے انسان کے دینی، سیاسی، سماجی اور اخلاقی انتشار کی فن کارانہ عکاسی کرتا ہے۔ ۱۹۷۱ کی جنگ کے دوران میں پاکستانی جہازوں کا آگرہ اور ہندوستان کے دیگر شہروں پر بمباری کرنا اور بنگلہ دیش کا ملکت خداداد سے الگ ملی تشخص قائم کر لینا ایسے حالات ہیں جنھیں ناول نگار نے غیر جانب داری سے پیش کیا ہے۔ جنگ کے نتیجے میں قوموں کے مٹتے ہوئے وجود کی عکاسی عمدہ ہے۔ یہ ناول ۱۹۷۱ کی پاک بھارت جنگ کے بحرانی دور کا عمدہ خاکہ پیش کرتا ہے۔ جنگ کے باعث ذاکر اور اس کے والدین کی ذہنی پریشانی جنگ کے دوران میں انسانی نفسیات کی عمدہ عکاسی کرتی ہے۔

انتظار حسین نے داستانوی علائم و رموز کے سہارے بستی کا تانا بانا بننے کی کوشش کی ہے۔ دوہری ہجرتوں کا المیہ ایک جانب اور دلی شکست ذات دوسری جانب علامتوں کے جال میں بستی کا روپ دھارتی ہیں۔ یہ صورت حال ہندوستان کے مسلمانوں کو جھیلنی پڑی جب انگریزوں نے ہندوستان پر قابض ہو کر نئے نظام کی تشکیل کی اور مسلمانوں کا استحصال کرنے لگے۔ انتظار حسین نے بستی میں اس المیہ کو بیان کیا ہے جب انگریزی استعماریت کے خلاف تحریک چل رہی تھی۔ اقتباس:

"ریشمیں رومال والے؟ وہ کون تھے؟ ریشمیں رومال والے کون تھے؟ چچا جان ہنسے: بیٹو تمہیں معلوم کیا ہے؟ ریشمیں رومال والوں نے انگریز کا تختہ الٹنے کا پورا منصوبہ بنا لیا تھا۔ تنت وقت پہ بھائی خان بہادر مرحوم نے تاڑا اور ریشمیں رومال بیچ میں سے اچک لیا۔" ۹

برطانوی نظام حکومت سے آزادی اور تقسیم ہند کے دوران ہونے والی سیاسی استحصال اور آزادی کے بعد ہونے والے واقعات کے کرب اور ایک نئی آبادی کاری کے دوران رونما ہونے والے واقعات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ نو آبادیاتی نظام اور اس کے اثرات ۷۵ سال گزرنے کے باوجود ہمارے اجتماعی لاشعور کا بیدار حصہ ہیں جو آج کے برصغیر کے شہری شخصیت پر اپنی مخصوص چھاپ رکھتا ہے۔ یہ سمندر کی تہہ میں موجود وہ ہلچل ہے جس کی ارتعاش سطح آب پر مدھم مگر مسلسل محسوس کی جا سکتی ہے۔

حواشی

۱۔ ناصر عباس نیر، نو آبادیاتی صورت حال، مشمولہ، 1857 کی جنگ آزادی اور زبان و ادب، مرتب ڈاکٹر ضیاء الحسن، ناصر عباس نیر، لاہور کلیہ علوم شرقیہ پنجاب یونیورسٹی، 2008 ص 64۔263
۲۔ ریاض ہمدانی، اردو ناول کا نو آبادیاتی مطالعہ، فکشن ہاؤس لاہور، 2018، ص 50
۳۔ ناصر عباس نیر، اردو ادب کی تشکیل جدید، آکسفورڈ پریس، 2016، ص 279
۴۔ انتظار حسین، بستی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2012، ص 7
۵۔ ایضاً، ص 41
۶۔ ایضاً، ص 50
۷۔ ایضاً، ص 87
۸۔ ایضاً، ص 131
۹۔ ایضاً، ص 45

❑❑❑

ڈاکٹر سعدیہ سلیم شمسی
شعبۂ اردو، سینٹ جانس کالج، آگرہ
9557757805

جیلانی بانو ”ایوانِ غزل“ ایک تجزیاتی مطالعہ

”ناول میں خواتین کردار، چاہے وہ چاند ہو، غزل، فاطمہ بیگم، بشیر بیگم یا لنگڑی پھوپھو، ہمیشہ سماجی اور خاندانی دباؤ کا شکار رہتی ہیں۔ بشیر بیگم کی جذباتی کیفیت اور فاطمہ بیگم کی بیٹی قصیر کی زندگی اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ خواتین اپنے گھرانوں میں محدود آزادی اور مردانہ تسلط کی وجہ سے کس حد تک مشکلات میں رہتی ہیں۔ چاند اور غزل کے کردار نہ صرف محبت اور ذاتی جدوجہد کی کہانیاں بیان کرتے ہیں بلکہ یہ بھی دکھاتے ہیں کہ کس طرح سماجی رویے، قدامت پرستی اور طبقاتی فرق خواتین کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ناول میں چاند کی المناک موت اور دیگر خواتین کرداروں کی مشکلات معاشرتی اور خاندانی دباؤ کے سنگین اثرات کی عکاسی کرتی ہیں۔“

انسان اس دنیا کے اسٹیج پر آتا ہے، اپنا کردار ادا کرتا ہے اور پھر رخصت ہو جاتا ہے۔ اس کائنات میں کسی شے کو بقا و دوام حاصل نہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے کتنے ہی ادباء اور شعراء اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ ایک عرصہ ایسا بھی آیا کہ یہ سلسلہ کچھ اس تیزی سے جاری رہا کہ ہر دوسرے دن کسی نہ کسی ادبی شخصیت کی وفات کی خبر موصول ہوتی اور دل غم سے مغمور ہو جاتا ہے۔ ہزاروں اولیا و اتقیا اور لاکھوں اہلِ علم و دانش اس فانی دنیا سے گزر گئے، لیکن ہر ایک نے اپنے حصے کا کردار ادا کیا اور تاریخ کے صفحات پر ایسے نقوش ثبت کر دیے کہ آج بھی قافلۂ ادب ان سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔

ادب کے افق پر ایسی عظیم ہستیاں جلوہ گر ہوئیں جن کی خدمات اور فکری ضوفشانی نے ایک عالم کو منور کر دیا۔ مگر یہ حقیقت بھی برقرار ہے کہ دنیا فانی ہے؛ جو بھی اس جہان میں آتا ہے اسے ایک نہ ایک دن رخصت ہونا ہی ہوتا ہے۔ گویا انسان ایک مقررہ مدت کے لیے اس دنیا میں آتا ہے اور مدت پوری ہوتے ہی واپس لوٹ جاتا ہے۔ اسی انجمن ادب کا ایک درخشاں ستارہ جیلانی بانو بھی تھیں جو یکم مارچ 2026 کو اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئیں لیکن اپنی گراں قدر تحریروں اور ادبی کارناموں کی بدولت ہمیشہ ہمارے دلوں اور یادوں میں زندہ رہیں گی۔

جیسا کہ ہوش نعمانی کا ایک خوبصورت شعر ہے:

جسم تو خاک ہے اور خاک میں مل جائے گا
میں بہرحال کتابوں میں ملوں گا تم کو

جیلانی بانو کو ہم نے نصاب کی حد تک ضرور پڑھا تھا لیکن ان کے فن اور شخصیت کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کا نہ کبھی موقع ملا اور نہ ہی اس طرف خاطر خواہ توجہ دی۔ کچھ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا۔ جیلانی بانو کی وفات کی خبر نے جہاں دل کو افسردہ کیا، وہیں یہ شوق بھی بیدار کیا کہ کیوں نہ ان کے فن کو گہرائی سے پڑھا جائے۔

جب ان کی تحریروں کا مطالعہ کیا تو اندازہ ہوا کہ وہ افسانے کی دنیا میں ایک منفرد شناخت رکھتی ہیں۔ اسی کے ساتھ ان کا ناول ”ایوانِ غزل“ اردو ادب میں ایک نایاب تحفے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ناول کا ذکر آتے ہی ایک دلچسپ واقعہ یاد آتا ہے: نیٹ کے امتحان میں سوال آیا تھا کہ ”ایوانِ غزل“ کس صنف سے تعلق رکھتا ہے، اور ہم نے جلدی میں اسے مجموعۂ کلام سمجھ کر نشان لگا دیا تھا۔ آج سوچتی ہوں کہ کاش جیلانی بانو کو پہلے ہی سنجیدگی سے پڑھ لیا ہوتا تو یہ سوال غلط نہ ہوتا۔

ناول کی ابتدا انور معظم کے ایک شعر سے ہوتی ہے:

یہ غزل کی انجمن ہے، ذرا اہتمام کر لو
کسی غم کو مئے بنا لو، کسی دل کو جام کر لو

یہ ابتدائی اشعار نہ صرف ناول کے موضوع اور فکری زاویے کو واضح کرتے ہیں، بلکہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ جیلانی بانو نے اس تحریر میں غم و کرب کی حقیقت کو کس قدر حسن و ترتیب کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ناول کے شروعات میں ہی ایک تقریب کے ہال کا منظر پیش کیا گیا ہے: پورا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے اور لوگ اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔

سمینار کا پہلا سیشن غزل کے موضوع پر تھا، اور اسی میں سے سراج ہاشمی نے غزل پر اپنے خیالات کچھ یوں بیان کیے:

''غزل کے متعلق ایک قدیم روایت یہ ہے کہ غزل کا تعلق دراصل غزال سے ہے۔ شکاری جب غزال کا شکار کرتے ہیں تو وہ زخمی ہونے کے باوجود بھاگتا ہے، شکاری بھی اس کا پیچھا کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ زخموں سے چور ہو کر گر پڑتا ہے۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں جو کرب اور مایوسی ہوتی ہے، اسے غزل کہتے ہیں۔''

لیکن اس ناول میں تو غزل کا ایک الگ ہی روپ دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہاں غزل ایک نہایت حسین و جمیل کردار کے طور پر جلوہ گر ہوتی ہے، جو ناول کے موضوع اور کرداروں کی عکاسی میں اہمیت رکھتی ہے۔ ناول میں ایک خاندان کی داستان پیش کی گئی ہے جو اپنی معاشرتی اور مالی مشکلات، نظریاتی اختلافات اور ذاتی خواہشات کے درمیان جدوجہد کرتا ہے۔ خاندان کے افراد مختلف سوچ اور نظریات کے حامل ہیں، جس سے معاشرتی تضاد اور پیچیدگی واضح ہوتی ہے۔ ناول کے مرکزی کردار، چاند اور غزل، اپنے تجربات اور حالات کے ذریعے معاشرتی اور اخلاقی چیلنجز کی عکاسی کرتے ہیں۔

جیلانی بانو نے اس ناول میں آزادی سے قبل اور بعد کے سیاسی و سماجی حالات، معاشرتی تبدیلیاں اور ثقافت کی نئی جہتوں کو موضوع بنایا۔ انہوں نے نہ صرف تاریخی پس منظر بیان کیا بلکہ یہ بھی دکھایا کہ کس طرح سماجی رویے، اخلاقی تضاد اور معاشرتی انحصال خاندانوں اور روزمرہ زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

ناول میں تین اہم خاندانوں کی کہانیاں بیان کی گئی ہیں:

واحد حسین کا گھرانہ: قدامت پرست اور موقع پرست ذہنیت کا حامل، جہاں خاندان کے افراد اپنے مفادات کے لیے سماجی اصولوں سے پیچھے نہیں ہٹتے۔

حیدر علی کا گھرانہ: ترقی پسند سوچ کے حامل، جہاں لڑکیوں کی تعلیم اور ذاتی آزادی کو اہمیت دی جاتی ہے۔ یہاں چاند کی پرورش محبت اور آزادی کے ماحول میں ہوتی ہے۔

مسکین علی شاہ طوطا چشمی کا گھرانہ: نام نہاد مرشد کے زیر اثر، جہاں خواتین کی عزت و وقار کا کوئی حساب نہیں، اور انہیں ذہنی و جسمانی دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چاند ایک آزاد خیال ماحول میں بڑی ہوئی، لیکن نوابی گھرانے میں قدامت پرستی، مردانہ تسلط اور خاندانی دباؤ کا سامنا کرتی ہے۔ اس کی زندگی میں تعلیم، ذاتی آزادی اور عشق کے تقاضے سب ایک ساتھ آتے ہیں۔

غزل کی زندگی مشکلات اور غیر منصفانہ رویوں کا شکار رہتی ہے۔ اس کے جذبات، محبت اور جدوجہد انسانی نفسیات اور عورت کے کردار کی پیچیدگیوں کو واضح کرتے ہیں چاند کی زندگی میں ایک اہم موڑ سنجیوا سے ملاقات کے بعد آتا ہے۔ جس کی محبت میں گرفتار ہو کر وہ اپنا جسم ہی نہیں بلکہ اپنی روح کی ساری عفت نچھاور کر دیتی ہے۔ حیدر علی خاں جب اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے کمزور پڑ جاتے ہیں تو اپنی خیریت کہلوانے کے لیے سنجیوا کو چاند کے پاس بھیجتے ہیں۔ سنجیوا کے لیے چاند کے نظریات کا منظر ملاحظہ کریں:

''اس نے غور سے سنجیوا کو دیکھا اس کے لمبے لمبے الجھے الجھے گھنے بالوں کا کوڑا سا بنا سر پر رکھا تھا اس کے نقوش بڑے تیکھے تھے بڑی بڑی مندی مندی آنکھوں میں جانے کیسی کشش تھی کہ چاند اسے بھولتی ہی نا تھی وہ بہت ہی معمولی سی پینٹ شرٹ پہنے تھا۔''

(ناول ایوانِ غزل ص 145)

''غزل چاہتی تھی کہ اسے بھی کسی کا پرخلوص پیار ملے لیکن پیار اور محبت کے نام پر اسے ہمیشہ دھوکے ہی ملتے رہے وہ مردوں کے لیے ایک کھلونا بن کر رہ جاتی ہے جس نے جب چاہا کھیلا اور چھوڑ دیا ناول میں کرداروں کی ایک لمبی قطار ہے اور ہر کردار اپنی ایک الگ شناخت رکھتا ہے۔

ناول میں غزل کی عجیب و غریب ذہنی کشمکش کے لیے اس کے والدین اور نانا برابر کے شریک ہیں۔ جنہوں نے چاند کو حد سے زیادہ آزادی دی اور غزل کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ غزل کی موت سے ناول میں ایک عجیب ہی سناٹا چھا جاتا ہے اور کرب و بے چینی کو دیکھا تا ہے ناول سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''غزل ایوانِ غزل سے رخصت ہونے لگی تو کسی کی، آنکھ میں آنسو نہ تھے رضیہ، فوزیہ، نفیس، نصیر سب سر جھکائے کھڑے تھے۔ آخری دیدار کے لیے آنکھوں میں غزل کے نقوش دھندلے ہونے لگے۔''

(ص.335)

ناول میں خواتین کردار، چاہے وہ چاند ہو، غزل، فاطمہ بیگم، بشیر بیگم یا لنگڑی پھوپھو، ہمیشہ سماجی اور خاندانی دباؤ کا شکار رہتی ہیں۔ بشیر بیگم کی جذباتی کیفیت اور فاطمہ بیگم کی بیٹی قصیر کی زندگی اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ خواتین اپنے گھرانوں میں محدود آزادی اور مردانہ تسلط کی وجہ سے کس حد تک مشکلات میں رہتی ہیں۔ چاند اور غزل کے کردار نہ صرف محبت اور ذاتی جدوجہد کی کہانیاں بیان کرتے ہیں بلکہ یہ بھی دکھاتے ہیں کہ کس طرح سماجی رویے، قدامت پرستی اور طبقاتی فرق خواتین کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ناول میں چاند کی المناک موت اور دیگر خواتین کرداروں کی مشکلات معاشرتی اور خاندانی دباؤ کے سنگین اثرات کی عکاسی کرتی ہیں۔

جیلانی بانو نے ''ایوانِ غزل'' میں نسوانی کردار، معاشرتی تضاد، طبقاتی فرق اور عورت کی جدوجہد کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ ناول قاری کو نہ صرف تفریح فراہم کرتا ہے بلکہ معاشرتی شعور، انسانی نفسیات اور اخلاقی سوالات پر غور کرنے کا موقع بھی دیتا ہے۔ ''ایوانِ غزل'' اردو ادب میں خواتین کے کردار، سماجی دباؤ اور انسانی جذبات کی پیچیدگیوں کی بہترین عکاسی کرتا ہے اور قاری کے ذہن میں دیرپا اثر چھوڑتا ہے۔

❑❑❑

التماس

''ماہنامہ نیا دور'' میں جن لوگوں کی ممبر شپ ختم ہو گئی ہو وہ زرِ سالانہ ارسال کرنے کی زحمت کریں جس سے ان کو رسالہ آئندہ بھی مستقل ارسال کیا جا سکے۔

پرواز احمد
بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی
7753027349

'میرے ہونے میں کیا برائی ہے' کا تنقیدی جائزہ

> ''اکیسویں صدی کے اس دور میں بھی جب ہم نے انسان کی شکل میں روبوٹ تک کی ایجاد کر لی ہے، دوسری دنیا کی سیر کرنے کرانے کے منصوبے تیار کیے جا رہے ہیں، آج اس دور میں بھی ٹرانس جینڈرز سماج کے حاشیے پر بھی نظر نہیں آتے۔ انھیں سماج خود سے بے دخل کر دیتا ہے۔ سماج کے اس رویے کی وجہ سے یہ لوگ تمام دنیا سے کٹ کر چند لوگوں پر مشتمل اپنا ایک الگ سماج اور ایک دنیا بنانے کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔ سماج اور پریوار کے اس بیگانے پن کی وجہ سے یہ لوگ اپنے جیسے لوگوں کے ساتھ ان ہی لوگوں کو اپنا گھر پریوار، ماں باپ، سماج اور سنسار ماننے لگتے ہیں۔ ان کے قبیلے میں ان کے احساسات و جذبات کے اظہار پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ انھیں ماں باپ سے دور قبیلے کی عمر دراز خواجہ سرا کو اپنی گرو ماں مان کر ان کے سائے میں رہنا لازمی بتایا جاتا ہے۔''

ہندوستان کے مختلف حصوں میں صرف دو قسم کی جنس کے متعلق باتیں ہوتی ہیں مذکر اور مونث۔ اشرف المخلوقات کے شرف سے نوازے جانے والے انسانوں کے اسی سماج میں ایک جنس اور ہے جس کو ہمارے سماج میں مختلف بھدے ناموں جیسے تیسری جنس یا تھرڈ جینڈر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی بھی جنس پہلی دوسری یا تیسری نہیں ہوتی بلکہ یہ مرد اساس سماج کی فکری پیداوار ہے۔ مرد اساس سماج خود کو ہمیشہ اول درجے میں رکھتا ہے اور بقیہ سماج کو اس کی پسماندگی کے اعتبار سے مختلف درجوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ سماج کے مختلف حصوں اور مختلف زبانوں میں اس برادری کے لیے کئی اصطلاحات رائج ہیں جن میں سے کچھ اس طرح ہیں۔ ہجڑا، خوجا، جنکھا، چھکا، اراونی، خسرا، کیو، پاویا، کوی، خواجہ سرا، شکھنڈی، ورہنلا، موسی، جوگپا، جوگتا وغیرہ۔ ہندی پٹی میں تو سماج، ادیب، انتظامیہ اور میڈیا وغیرہ کے لوگ اس برادری کے لیے 'کنر' لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔ رینو بہل نے اپنے ناول ''میرے ہونے میں کیا برائی ہے'' میں معاشرے کے انہی افراد کو ناول کا موضوع بنایا ہے جن کے وجود کو ہمارے سماج نے کبھی تسلیم ہی نہیں کیا۔ ہمارا سماج اس حقیقت سے ہمیشہ نظریں چراتا رہا ہے اور اس برادری کو اچھوت اور حقارت بھری نظروں سے دیکھتا رہا ہے۔ سماج کی اس برادری کو لوگ اس قدر ذلیل، غلیظ اور حقیر سمجھتے ہیں کہ ان کے متعلق اپنے گھر پریوار یا سماج میں بات کرنے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ معاصر اردو کے افسانوی ادب میں رینو بہل ایک الگ لکیر کھینچتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ سماج جس حقیقت کو اچھوت اور حقارت بھری نظروں سے دیکھتا ہے ایسے موضوعات پر کچھ بھی لکھنا خود میں لام لینے جیسا ہو جاتا ہے۔ جو موضوعات سماج اور تہذیب کا کبھی حصہ ہی نہ رہے ہوں ایسے موضوعات پر قلم اٹھانا تعلیم یافتہ لوگوں کے بیچ بھی بعض دفعہ مسخرے اور ہنسی مذاق کا موضوع بن جاتا ہے۔ لیکن رینو بہل نے بڑی ہمت اور حوصلے کے ساتھ اس موضوع کو اپنے ناول کا حصہ بنایا ہے اور اس طبقے کی حقیقت کی طرف سماج کی توجہ مبذول کرائی ہے۔

ناول ''میرے ہونے میں کیا برائی ہے'' رینو بہل کا دوسرا ناول ہے۔ یہ ناول سنہ 2017 میں منظر عام پر آیا۔ ہندوستان کی عدالت عظمیٰ نے اپریل 2014 میں ٹرانس جینڈرز کو قبولیت اور شہریت کا درجہ دیا تھا۔ تقریباً دس برسوں کی اس مدت میں اردو ادب میں اس موضوع پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔ نہ رینو بہل کے پہلے نہ ہی ان کے بعد۔ ناول ''میرے ہونے میں کیا برائی ہے'' میں فنی اعتبار سے ناول کے پلاٹ میں ناول اور قاری کے درمیان وہ رشتہ قائم ہوتا دکھائی دیتا ہے جس سے قاری کا تجسس قصے کے آخر تک برقرار رہتا ہے۔ اس ناول میں ایک ٹرانس جینڈر شخص کی حقیقی زندگی کے ان واقعات کو موضوع بنا کر پیش کیا گیا ہے جس کو ایک عام انسان کبھی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ ناول ''میرے ہونے میں کیا برائی ہے'' کا پلاٹ بہت گٹھا ہوا اور اپنے موضوع کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ناول میں زندگی کے واقعات کے بیچ ربط و تسلسل شروع سے آخر تک برقرار رہتا ہے۔ ناول کی کہانی کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے لیکن پلاٹ کی ترتیب چاروں حصوں کو ایک دوسرے سے مربوط کیے ہوئے ہے۔ کہانی کا آغاز اور وسط تو چست ہے مگر اختتام اچانک غیر متوقعہ طور پر ہو جاتا ہے۔

واقعہ نگاری میں ٹرانس جینڈرز کی حقیقی زندگی کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ جس میں شیکھا اور اس کے گھر کے واقعات، شیکھا اور راشد کے واقعات، شیکھا اور اس کی سہیلی ستارہ کے واقعات، اور اس قبیلے کے واقعات جہاں سے شیکھر کو شیکھا کا نام دیا گیا تھا وغیرہ واقعات پیش کیے گئے ہیں۔ یہ سبھی واقعات ایک دوسرے سے مربوط نظر آتے ہیں۔ ناول کی کردار نگاری کا جائزہ لیں تو اکیسویں صدی کے بیشتر اردو ناولوں کی کردار نگاری میں جھول دکھائی دیتا ہے لیکن ناول ''میرے ہونے میں کیا برائی ہے'' میں

شیکھا اور ستارہ بڑے متحرک کردار کی شکل میں سامنے آتے ہیں شیکھا اور ستارہ کے علاوہ ناول کے دیگر کردار بھی متحرک اور فعال نظر آتے ہیں۔ان کرداروں کے ذریعے ناول میں جو واقعات پیش آتے ہیں وہ حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں۔ان فطری کرداروں کی پیشکش سے ناول اور جاذب اور کامیاب ہوتا نظر آتا ہے۔ناول کی منظر نگاری اس قدر قابل ستائش ہے کہ ناول میں روح اُبھرتی نظر آتی ہے۔ چاہے وہ شیکھا کے گھر کا منظر ہو، ستارہ سے بات چیت کے درمیان کا منظر ہو یا پھر شیکھا کو قبیلے میں شامل کرتے وقت کا منظر ہو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آنکھوں کے سامنے سارا منظر چل رہا ہو۔ناول کی زبان و بیان کی بات کریں تو ناول میں نسبتاً سادہ اور آسان زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔ناول میں عام بول چال کی زبان کا بھی بخوبی استعمال کیا گیا ہے۔مکالمے کے درمیان ٹوہنا، دھت، پچکار، منگیتر، جھینپ، دھتیے، اینڑھ، ڈھانپ، منڈلا وغیرہ قسم کے عام بول چال کے الفاظ کا استعمال بڑی خوبصورتی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس سے ناول کی مکالمہ نگاری، زبان و بیان اور ایک ٹرانس جینڈر کے جذبات کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

”میں ٹھیک ہوں اماں۔آپ سب کی بہت یاد آتی ہے۔“یہ کہتے ہوئے میں نے ان کی گود میں سر رکھ دیا۔وہ میرے بال سہلانے لگی”کیسی شکل بنائی ہے تو نے؟ میرے شیکھر کو کہاں چھپا دیا؟“”چھوڑو اماں۔تم بتاؤ کیسی ہو؟ کتنی کمزور ہو گئی ہو۔اکثر بیمار کیوں رہنے لگی ہو؟ میں نے اماں کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر چومتے ہوئے کہا۔“

(میرے ہونے میں کیا برائی ہے از رینو بہل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2017، صفحہ نمبر 64)

نقطہ نظر کی بات کریں تو فنکار واضح طور پر ٹرانس جینڈرز کے ساتھ نظر آتی ہیں۔کبھی ان کے وجود کی بات کرتی ہوئی تو کبھی ان کے حقوق کی بات کرتی ہوئی۔ناول نگار نے اپنے ناول ”میرے ہونے میں کیا برائی ہے“ کے ذریعے ایک ایسے سماجی مسئلے کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے جس کی طرف اردو ادیبوں نے کبھی توجہ ہی نہیں دی۔یہ مسئلہ ٹرانس جینڈرز کے وجود اور ان کی پہچان کا مسئلہ ہے۔ناول کا عنوان ”میرے ہونے میں کیا برائی ہے“، ہی اپنے آپ میں ایک سوال ہے۔یہ سوال سماج سے ہے، پوری انسانیت سے ہے اور خود سے بھی ہے۔ناول کا آغاز اس بچّے کے ساتھ ہوتا ہے جو بچپن میں ہی گھر سے بے گھر کر دیا جاتا ہے۔صرف اس لیے کہ وہ جس گھر میں پرورش پاتا ہے وہاں ٹرانس جینڈرز کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی ہے۔گھر والے اس بات سے شرمندگی محسوس کرتے ہیں کہ سماج میں لوگ کیا کہیں گے۔جب کہ دیگر مخلوقات کی طرح ٹرانس جینڈرز بھی خدا کی ایک مخلوق ہی ہیں۔لیکن آج بھی ہمارا سماج اس حقیقت کو قبول نہیں کر پاتا ہے۔سماج کے اس رویے کا اس شخص پر اور اس کی نفسیات پر کیا اثر پڑتا ہے اس کا اندازہ ناول کے درج ذیل اقتباس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

”بے شک انھوں نے اپنی زندگی سے عاق کر دیا مگر کیا عاق کرنے سے خون کے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں؟ کیا میری رگوں میں بہتا خون اس ماں کا نہیں؟ کیا خون کی جگہ میری شریانوں میں پانی بہنے لگا ہے؟ نہیں۔میرے جیتے جاگتے وجود سے وہ انکار نہیں کر سکتے۔میں نے بھی ماں کی کوکھ سے ہی جنم لیا ہے میں کوئی آسمان سے نہیں ٹپکی نہ ہی زمین سے اُگی ہوں۔میں آج جو ہوں، جیسی بھی ہوں، اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔“

(میرے ہونے میں کیا برائی ہے از رینو بہل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2017، صفحہ نمبر 12)

ٹرانس جینڈرز فطری طور پر نسوانی جذبات کے مالک ہوتے ہیں لیکن ظاہری طور پر وہ مردانہ جسم کے مالک ہوتے ہیں یا یوں کہا جائے کہ ایک مرد کے جسم میں عورت کی روح ہوتی ہے۔ان کے اندر وہی احساسات و جذبات، محبت اور ہمدردی پائی جاتی ہے جو ایک عورت میں ہوتی ہے۔لیکن گھر کے افراد ان کے جذبات کو دباتے اور جھٹلاتے ہوئے مردانہ چال ڈھال اختیار کرنے اور مردانہ سوچ پیدا کرنے کے لیے زور دیتے ہیں۔ایسا نہ کرنے پر ایک وقت کے بعد ان کو گھر سے نکال باہر کر دیا جاتا ہے۔یہ سارے عمل اپنے آپ کو محفوظ کرنے سے عبارت ہیں۔لوگ میرے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے جیسی سوچ کے تحت کیے جاتے ہیں۔ایک ماں اپنے کسی بچے کو خود سے دور نہیں دیکھنا چاہتی لیکن سماج کے ڈر سے ایک ماں بھی اپنے بچے کو گھر سے نکالنے اور اسے خود سے دور کرنے کے لیے مجبور ہوتی ہے۔رینو بہل اپنے ناول میں ایسے واقعات کو کچھ یوں بیان کرتی ہیں۔

”بیس سال تک جسے وہ گھر کا بیٹا کہتے رہے اب اسے بیٹی مان لینا ان کے لیے آسان نہیں۔اور بیٹی بھی کیسی، آدھی ادھوری جس کا جسم تو مرد کا ہے مگر روح عورت کی۔“

(میرے ہونے میں کیا برائی ہے از رینو بہل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2017، صفحہ نمبر 16)

اکیسویں صدی کے اس دور میں بھی جب ہم نے انسان کی شکل میں روبوٹ تک کی ایجاد کر لی ہے، دوسری دنیا کی سیر کرنے کرانے کے منصوبے تیار کیے جا رہے ہیں، آج اس دور میں بھی ٹرانس جینڈرز سماج کے حاشیے پر بھی نظر نہیں آتے۔انھیں سماج خود سے بے دخل کر دیتا ہے۔سماج کے اس رویے کی وجہ سے یہ لوگ تمام دنیا سے کٹ کر چند لوگوں پر مشتمل اپنا ایک الگ سماج اور ایک دنیا بنانے کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔سماج اور پریوار کے اس بیگانے پن کی وجہ سے یہ لوگ اپنے جیسے لوگوں کے ساتھ ان ہی لوگوں کو اپنا گھر پریوار، ماں باپ، سماج اور سنسار ماننے لگتے ہیں۔ان کے قبیلے میں ان کے احساسات و جذبات کے اظہار پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔انھیں ماں باپ سے دور قبیلے کی عمر دراز خواجہ سرا کو اپنی گرو ماں مان کر ان کے سائے میں رہنا لازمی بتایا جاتا ہے۔

اس مرد اساس سماج میں پیدا ہوئے ٹرانس جینڈرز کو ابتدا سے مرد کی طرح مردوں کے لباس میں ہی رہنا پڑتا ہے۔ان کو نام بھی مردوں والے ہی دیے جاتے ہیں لیکن ایک مدت کے بعد جب کوئی ٹرانس جینڈر اپنی برادری یا قبیلے میں شامل ہوتا ہے تو وہاں اس کو اس کی مرضی کے مطابق لڑکی کا نام دیا جاتا ہے۔جیسے ناول ”میرے ہونے میں کیا برائی ہے“ میں نورا ایک روز ستارہ بن جاتی ہے اور شیکھر کو ایک روز شیکھا کا نام دے دیا جاتا ہے۔ٹرانس جینڈرز کے قبیلے میں بھی کئی گھرانے ہوتے ہیں۔ناول میں شیکھا دہلی والے گھرانے میں شامل کی گئی تھی۔ٹرانس جینڈرز کی زندگی سے جڑی اس قسم کی مشکلات کو رینو بہل اپنے ناول ”میرے ہونے میں کیا برائی ہے“ میں ایک بہترین منظر نگاری کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔شیکھا کے ٹرانس جینڈرز کی بستی میں داخل ہوتے وقت کے جذبات کو رینو بہل درج ذیل اقتباس میں اس طرح پیش کرتی ہیں۔ملاحظہ فرمائیں۔

”ایک روز ستارہ مجھے اپنے ساتھ اس بستی میں لے گئی جدھر اس جیسے ہی لوگ رہتے تھے۔پہلی بار احساس ہوا کہ یہ دنیا میری دنیا ہے۔اب تک میں کیوں اس ماحول اس دنیا سے دور تھا۔ یہاں مرد کے جسم میں عورت رہتی ہیں جسے ہجڑا نام دے دیا جاتا ہے۔“

(میرے ہونے میں کیا برائی ہے از رینو بہل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2017، صفحہ نمبر 22)

اس ناول کے ذریعے سماج کے اس گھناؤنے پہلو پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جہاں سماج کے بیگانے پن اور قدرت کی ہی عطا کی ہوئی چیز کو قبول نہ کرنے اور نفرت کرنے کی وجہ سے سماج میں ایک الگ طرز کی جسم فروشی، ڈپریشن، غریبی، بے روزگاری اور ایڈز جیسی

بڑی بیماریوں سے انسان کو جان تک گنوانی پڑ جاتی ہے۔گھر اور سماج سے بے دخل کر دیے جانے پر ایک ٹرانس جینڈر شخص کو لا تعداد نئی نئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جیسے تعلیم سے دور دور تک کوئی واسطہ نہ ہونا، سماج میں اٹھنے بیٹھنے پر پابندی لگا دینا، لوگوں سے ملنے جلنے پر پابندی لگا دینا، ماں سے ملنے کی خواہش پر دن میں نہ ملنے دینا، معاشی بدحالی، لوگوں کی حقارت بھری نظریں، کوئی کام یا نوکری نہ ملنا وغیرہ۔ناول میں تنگ حالی سے لڑنے اور معاشی حالات کو سدھارنے کے لیے قبیلے کی گروماں کے ذریعے شادی میں گیت گانے اور رقص وغیرہ کرنے کے فن سکھائے جاتے ہیں۔ناول میں ٹرانس جینڈرز کے معاشی حالات اور ان کی مشکلات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

"دراصل اپنے ہی گھر اور معاشرے میں ہماری کوئی جگہ نہیں۔اس لیے یہ معاشرے سے کٹے رہتے ہیں اور احساس کمتری کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔تعلیم کی کمی کی وجہ سے نوکری بھی نہیں ملتی۔اوپر والے نے پیٹ تو سب کو لگایا ہے اور اس پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے لوگوں کے گھر بدھائی گانا، ناچنا، بھیک مانگنا یا پھر جسم فروشی ہی معاش کا ذریعہ رہ جاتا ہے۔"

(میرے ہونے میں کیا برائی ہے از رینو بہل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2017، صفحہ نمبر 35)

ٹرانس جینڈرز کے قبیلے میں 'نروانا' ایک روایت ہے جو سماج پر ایک بھدا طنز ہے۔ ہمارے سماج سے ٹرانس جینڈرز کے بے دخل کر دیے جانے کے بعد دیگر ٹرانس جینڈرز کے ذریعے اس رسم کے تحت انہیں ندی یا سمندر کے کنارے عریاں کر کے ان کے اندر اس سوچ کو مستحکم بنایا جاتا ہے کہ ہاں وہ ایک ٹرانس جینڈر ہیں۔اور ان کے ٹرانس جینڈر ہونے کے گواہ اب یہ ندی، سمندر، پہاڑ اور قدرت بھی ہوں گے۔یہ رسم اس قدر بھدی ہوتی ہے کہ شیکھا سہم جاتی ہے اور اس رسم سے انکار کر دیتی ہے۔اس ضمن میں ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"عموماً نئے بنے ہیجڑے کو سمندر کے پاس لے جاتے ہیں۔کچے دودھ کا ایک جگ پانی میں ڈلوایا جاتا ہے۔اس کے بعد سمندر کی طرف اپنا منہ کر کے اپنا جسم، جس میں عضو تناسل غائب ہوتا ہے وہ پہلے سمندر کو اس کے بعد کسی کالے کتے کو اور پھر ہرے بھرے شجر کو دکھایا جاتا ہے۔۔۔آسمان، سمندر، پیڑ پودے، جانور یعنی پوری کائنات اس بات کی گواہی دیں گے کہ ہاں یہ ہیجڑا ہے۔"

(میرے ہونے میں کیا برائی ہے از رینو بہل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2017، صفحہ نمبر 42)

اس ناول کے ذریعے ٹرانس جینڈرز کے نشے میں دُھت رہنے کی ایک بڑی وجہ ڈپریشن نظر آتی ہے۔سماج کے سرد رویے کی وجہ سے وہ ہمیشہ ڈپریشن میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ واپس اپنے گھر بھی جانا چاہتے ہیں، اپنے ہی سگے بھائیوں کی طرح علم حاصل کرنے کی بھی چاہت رکھتے ہیں لیکن ہر بار ہر بات سماج پر آ کر رُک جاتی ہے کہ ان کے ہونے سے سماج میں والدین کو بے عزتی کا سامنا کرنا پڑے گا۔گھر سے ایک بار پھر دھتکارے اور بھگائے جائیں گے۔ناول میں نشے کی حالت میں ستارہ اپنی جان گنوا دیتی ہے۔ٹرانس جینڈرز کی موت کے بعد ان کو دفنایا جاتا ہے۔سماج میں ان کی قبولیت نہ ہونے کی وجہ سے کسی ٹرانس جینڈر کے مرنے پر سبھی اس بات کی دعا کرتے ہیں کہ دوبارہ اس کا جنم اس طرح کبھی نہ ہو۔ناول کے مطالعے سے ٹرانس جینڈرز کی موت کے متعلق یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بیشتر ٹرانس جینڈرز فطری موت کے بجائے خودکشی کر لیتے ہیں یا پھر نشے کی حالت میں وہ کہیں بھی حادثاتی موت کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ستارہ کی موت پر ناول کا وہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں جس میں گروماں اس کو دوبارہ کبھی اُس حالت میں جنم نہ لینے کی دعا دیتی ہیں:

"رب تیرے سب گناہ اسی جنم میں بخش دے اور اگلے جنم میں تو مکمل انسان بن کر زمین پر آئے۔"

(میرے ہونے میں کیا برائی ہے از رینو بہل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2017، صفحہ نمبر 83)

ناول "میرے ہونے میں کیا برائی ہے" میں ٹرانس جینڈرز اپنے دو ناموں، دو قسم کے لباس اور دو طرح کے جذبات میں اُلجھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ناول میں یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ ایک مرد اساس سماج اپنی ہی اولاد کو ٹرانس جینڈر ہونے پر اپنے گھر میں جگہ دینے کے لیے اس کے احساسات و جذبات کو روندتا رہتا ہے۔سماج اُسے جبراً مرد کے روپ میں اور مردانہ جذبات کے ساتھ قبول کرتا ہے ورنہ انھیں اپنے سماج اور گھر سے بے دخل کر دیتا ہے۔ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس سے شیکھا اور اس کی ماں کی باپ کے سامنے لاچاری کا اندازہ ہوتا ہے۔

"چھوڑو اماں۔تم بتاؤ کیسی ہو؟ کتنی کمزور ہو گئی ہو۔اکثر بیمار کیوں رہنے لگی ہو؟" میں نے امّاں کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر چومتے ہوئے کہا۔"جس کے جگر کا ٹکڑا اس کی نظروں سے دور چلا جائے، جسے جیتے جی مار دیا جائے، اس ماں کا یہ ہی حال ہوتا ہے۔" "وہ تو خیر اس وقت تیرے بابا گھر پر نہیں۔اگر ہوتے تو میں تجھ سے مل بھی نہ پاتی۔قسم دی ہے انھوں نے مجھے تجھے کبھی گھر میں نہ آنے دوں۔" "اسی لیے گھر سے باہر اس بیماری کی حالت میں ملنے آئی ہو؟"

(میرے ہونے میں کیا برائی ہے از رینو بہل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2017، صفحہ نمبر 64)

ٹرانس جینڈرز کی تہذیب میں سب برابر کے حق دار ہوتے ہیں۔ٹرانس جینڈرز کے قبیلے میں سبھی مذاہب کی عزت کی جاتی ہے اور سبھی مذاہب کے رسم و رواج اور تیج تیوہار منائے جاتے ہیں۔ان کے قبیلے میں باپ بھائی جیسا کوئی رشتہ نہیں ہوتا جو انھیں دھکے مار کر باہر نکال دیتا ہے بلکہ محبت کرنے والی گروماں، گرو بہن اور دوست کے رشتے ہوتے ہیں۔رینو بہل نے اس ناول کے ذریعے ٹرانس جینڈرز کی زندگی کی ان مشکلات پر روشنی ڈالی ہے جس میں زندگی بسر کرنا جیتے جی مرنے جیسا ہوتا ہے۔جن لوگوں کو لگتا ہے کہ ٹرانس جینڈرز بڑے غیر مہذب ہوتے ہیں، یہ ناول ان لوگوں اور سماج کے مہذب ہونے پر سوال کھڑا کرتا ہے۔ایک ہی ماں کے بطن سے پیدا ہونے والے شخص کو سماج کیوں نہیں قبول کرتا ہے؟ کیا وہ قدرت کی مخلوق نہیں ہیں؟ اس کو بھی بقیہ لوگوں کی طرح انسانی اور بنیادی حقوق کیوں نہیں دیے جاتے؟ ان کے پیٹ کا خیال رکھتے ہوئے انھیں نوکری کیوں نہیں دی جاتی ہے؟ وہ کون لوگ ہیں جو انھیں ایک انپڑھ اور غیر مہذب زندگی کی طرف جبراً دھکیل دیتے ہیں؟

اکیسویں صدی کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ گزرنے کو ہے۔آج دنیا کے تمام ممالک اپنی اپنی ترقی اور کامیابی کا اشتہار وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں۔Super Power کے طور پر جانے جانے والے ملک امریکہ کے صدر کا شہریت کے متعلق بیان کچھ اس طرح آتا ہے کہ Male Female کے علاوہ کسی تیسری جنس کو شہریت کی سند نہیں دی جائے گی۔دنیا میں کئی ایسے ممالک ہیں جہاں ٹرانس جینڈرز کو آج بھی شہریت نہیں دی جاتی۔لیکن وہیں بعض ایسے ممالک بھی ہیں جہاں دھیرے دھیرے ٹرانس جینڈرز کے وجود کو تسلیم کیا جانے لگا ہے۔ٹرانس جینڈرز کی زندگی، ان کے مسائل اور ان کی مشکلات کو سمجھنے کے لیے ان کا سماجی، نفسیاتی، اور معاشی مطالعہ ضروری ہے۔آج ہمارے سماج کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان کے وجود کو تسلیم کرے اور ان کی زندگی کو بہتری کی طرف لانے کی پہل کرے۔اور یہ تب ہی ممکن ہو سکتا ہے جب ہم ایک کھلی سوچ کے مالک ہوں گے۔سماج میں ٹرانس جینڈرز کے وجود اور حقوق کو لے کر ناول نگار رینو بہل نے ایک اچھی اور زبردست پہل کی ہے۔

□□□

غزل

دل پہ ایک بوجھ ترے غم کا اٹھایا جائے
کیوں نہ پھر سے ہی ترے شہر میں آیا جائے

ابر چھایا ہے تری یاد کی تنہائی کا
دل سے لپٹے ہوئے شعلوں کو بجھایا جائے

میرے حصّے میں تو ایک بوند کی آہٹ بھی نہیں
اور ترا شہر کہ بارش میں نہایا جائے

دل کے ٹوٹے ہوئے ریشوں کی یہ انتم ہچکی
پوچھو اس کو تو ذرا یاد کیوں آیا جائے

سانس لیتی ہے میری سانس ابھی فرقت سے
اتنی جلدی نہ ابھی شمع بجھایا جائے

تجھ کو چھونے کی خرابی سے رہا ہوں محفوظ
تو وہ گُل ہے کہ جسے دور سے چاہا جائے

آ کے بیٹھا ہے بہت دور سے تنہائی میں
دل کی ٹہنی سے وہ پنچھی نہ اُڑایا جائے

رضوان بیگ مرزا
جامع مسجد چوک، اولڈ تحصیل روڈ، اکولہ
9850291851

غزل

تیری زباں جو بولتی ہے رہنمائے وقت
میں جانتا ہوں یہ ہے سرابِ نوائے وقت

دو چار ہوں میں جس سے بصد عزم و حوصلہ
اللہ دشمنوں پہ بھی ایسا نہ لائے وقت

دیکھے گا کون غور سے اب داغہائے دل
آماجگاہِ داغ ہوئی ہے قبائے وقت

مٹھی میں اپنی وقت کو رکھتے تھے لوگ جو
دے کر دہائی کہتے ہیں وہ ہائے ہائے وقت

فی الوقت یہ توانا نہیں ہے نحیف ہے
میری صدا بنے گی کسی دن صدائے وقت

آتا ہے ہم کو وقت کی نبضیں ٹٹولنا
خلقت ہمیں پکارتی ہے آشنائے وقت

مرضی سے اس کی بن گئے کچھ کام کیا جمیلؔ
خود کو وہ اب سمجھنے لگا ہے خدائے وقت

جمیل احمد جمیلؔ
۲۹۵/۱۳۹، دین دیال روڈ، اشرف آباد، لکھنؤ
9415750888

غزل

محبتوں کا مری اعتراف کرتا ہے
مرا قصور بھی اکثر معاف کرتا ہے

مری صداؤں پہ لبیک بولنے والا
سنا ہے سازشیں میرے خلاف کرتا ہے

اسے پتہ ہے کہ چہرے پہ داغ ہے لیکن
وہ جان بوجھ کے آئینہ صاف کرتا ہے

مرے ارادوں سے واقف عدو نہیں ہوتے
کوئی تو راز مرے انکشاف کرتا ہے

جو ذکر یار نہ ہو سردیوں کی راتوں میں
بدن سے دور کوئی کب لحاف کرتا ہے

سخنوری کا سلیقہ نہیں اسے لیکن
جہاں بھی دیکھو وہاں شین قاف کرتا ہے

کمال جلتے ہیں جب ہم چراغ کی صورت
ہوا کا جھونکا ہمارا طواف کرتا ہے

کمال بلیاوی
نورگانڈی، پائپ روڈ کرلا، ویسٹ ممبئی
9224232770

غزل

اپنے غم کا کبھی اے کاش مداوا نکلے
اُن سے ملنے کا کسی طور بہانہ نکلے

ساتھ میں رہتے ہوئے بھی نہ کبھی مل پائے
جیسے ہم دونوں ہی دریا کا کنارا نکلے

کھود کر دیکھ مرے دل کی زمیں کو اے دوست
کیا خبر اِس میں محبت کا خزانہ نکلے

اُس نے جب تیر چلایا تو ہزاروں تھے وہاں
باوجود اِس کے ہم ہی اُس کا نشانہ نکلے

تیرے کہنے پہ چلا آیا ہوں اے دوست مگر
جب کہ ممکن ہے کہ اِس بار جنازہ نکلے

جن درختوں کو کبھی کاٹ دیا تھا تم نے
جانے کتنے ہی پرندوں کا ٹھکانہ نکلے

جو بھی دیکھے گا اُسے ہوش گوا دے گا شان
کبھی چلمن سے جو وہ حسن سراپا نکلے

شان علی (شان مصباحی)
اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی، ہلدوانی
9917160447

غزل

عشق میں جب بھی سانحہ ہوگا
دل ہی ٹوٹے گا اور کیا ہوگا

رات کو فون میں نہیں کرتا
وہ کوئی خواب دیکھتا ہوگا

اپنی ہمت جواں تو رکھو
اس سمندر میں راستا ہوگا

اسکو فرصت کبھی نہیں ہوگی
آدمی جو بھی کام کا ہوگا

اپنے گھر میں بڑا تو میں ہی ہوں
ہر کوئی مجھ سے ہی خفا ہوگا

اصل صورت دکھائے گا میکش
آئینہ جب بھی آئینہ ہوگا

میکش اعظمی
موضع بیریڈیہ پوسٹ لال گنج، ضلع اعظم گڑھ
9919142755

शेड्यूल
घोषणा–पत्र फार्म
(नियम -3 देखें)

मैं विशाल, निदेशक, सूचना एवं जन सम्पर्क विभाग, उ0प्र0 लखनऊ घोषणा करता हूं कि मैं 'नया दौर उर्दू' मासिक पत्रिका, का प्रकाशक हूं, जो लखनऊ से प्रकाशित एवं मुद्रित की जायेगी तथा उक्त के सम्बन्ध मे जो विवरण दिये गये है, वह मेरी जानकारी और विश्वास के अनुसार सही है।

1. पत्र/पत्रिका का नाम	नया दौर उर्दू मासिक पत्रिका
2. पत्र/पत्रिका की भाषा (जिसमे इसे प्रकाशित करना है।)	उर्दू
3. प्रकाशन आवधिकता	
1 दैनिक/साप्ताहिक/पाक्षिक/मासिक	मासिक
2 प्रातः कालीन समाचार पत्र है या सायंकालीन	मासिक
3 दैनिक के अतिरिक्त अन्य समाचार पत्र के मामले में कृपया दिन/उन दिनों/तिथियों को उल्लेख करें जिसमे वह प्रकाशित होगा।	
4 समाचार पत्र/पत्रिका का खुदरा मूल्य	रू0 15–00
1. यदि समाचार/पत्रिका का वार्षिक चन्दा लिया जाता है तो उसका उल्लेख करें।	रू0 180–00
5 प्रकाशक का नाम	विशाल सिंह
राष्ट्रीयता	भारतीय
पता	निदेशक, सूचना एव जनसम्पर्क विभाग, प0 दीनदयाल उपाध्याय सूचना परिसर, पार्क रोड, लखनऊ।
6 प्रकाशक का स्थान व पूरा पता	यथोपरि।
7 मुद्रक का नाम	प्रकाश नारायण भार्गव
राष्ट्रीयता	भारतीय
पता	श्रीमंत प्रकाश पैकेजर्स प्लॉट न0 755/99A, गोयला इन्डस्ट्रियल एरिया, चिनहट, देवा रोड, लखनऊ–226019
8 मुद्रण प्रेस का नाम जहां कार्य किया जाता है तथा उसके परिसरो का सही व (विस्तृत) विवरण जिसमें प्रेस लगी हो	श्रीमंत प्रकाश पैकेजर्स प्लॉट न0 755/99A, गोयला इन्डस्ट्रियल एरिया, चिनहट, देवा रोड, लखनऊ–226019
9 सम्पादक का नाम	आशिया खातून
राष्ट्रीयता	भारतीय
पता	द्वारा निदेशक, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग,
10 स्वामी का नाम	निदेशक, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, प0 दीनदयाल उपाध्याय सूचना परिसर, पार्क रोड, लखनऊ।
1. कृपया फर्म विस्तृत पूजी कम्पनी न्याय व्यक्तियो के नाम जो समाचार पत्र का स्वामी हो।	निदेशक, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, प0 दीनदयाल उपाध्याय सूचना परिसर, पार्क रोड, लखनऊ।
2 कृपया उल्लेख करे कि क्या स्वामी के कोई अन्य समाचार पत्र भी है और हो तो उसका नाम। निम्नलिखित के संबंध में है–	(उर्दू मासिक पत्रिका) नया दौर,
1.– एक नये समाचार पत्र के बारे मे	नही
2– एक चालू समाचार पत्र के बारे में	हां
3– घोषणा– प्रस्तुत करने का कारण	सम्पादक के नाम एवं पता मे परिवर्तन के कारण

(विशाल सिंह)
सूचना निदेशक

पत्र सं0/04/प्रेस/नगर/मजि0 दिनांक- 13-3-2026

شاہد اختر

نورا پارٹمنٹ فلیٹ نمبر ۲۰۵، پریم نگر، کانپور

9450143117

افسانہ

درخت

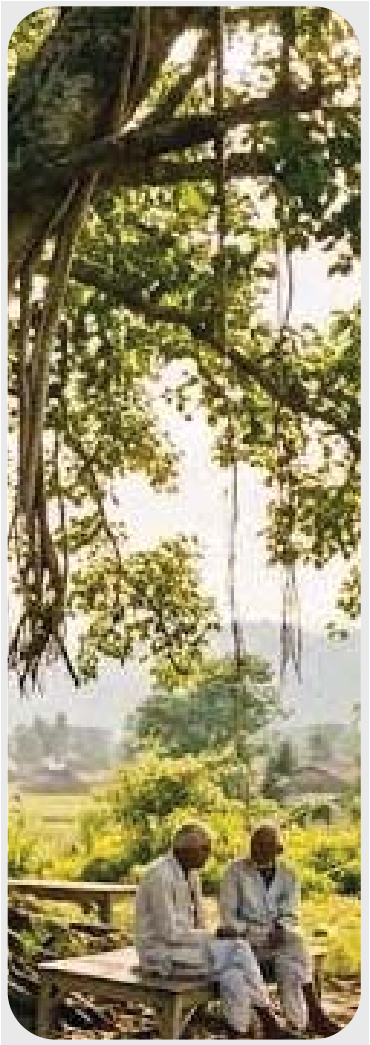

وہ روز کی طرح اپنے وقت پر دفتر سے گھر واپس آ گئے اور حسب معمول صحن میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔ میز پر چمڑے کا چھوٹا سا پرس رکھا اور کرسی سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ آرام کا ان کا یہ اپنا طریقہ تھا، دس پانچ منٹ وہ اسی طرح گزارتے اس کے بعد کپڑے تبدیل کر منہ دھوتے اور پھر واپس اسی کرسی پر۔ اتنی دیر میں نجمہ چائے بنا لیتی اور پھر دونوں بیٹھ کر باتیں کرتے۔ چائے تو ذرا دیر میں ختم ہو جاتی مگر گفتگو کا سلسلہ کافی دیر تک قائم رہتا۔ تقریباً یہ روز کا معمول تھا۔

نجمہ کی آواز پر وہ چونکے۔ جھٹ آنکھ کھولی تو وہ سامنے کرسی پر بیٹھ چکی تھیں۔

''آخر۔۔۔داغ لگا۔۔ہی لئے۔۔۔''؟ فوراً ان کا دھیان اپنی نئی سفید شرٹ کی طرف گیا جس پر پان کے دھبے نمایاں تھے۔ جواب میں وہ مسکرا دیے۔

''آپ مسکرا کر بات نہ ٹالا کیجئے۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ سفید کپڑے آپ نہ پہنا کریں۔ غضب خدا کا ایک دن بھی محفوظ نہ رکھ سکے۔ سفید کپڑوں پر یہ داغ دور سے ہی نظر آتے ہیں۔''

''معلوم۔۔۔ہے۔۔۔بیگم۔۔۔اور کاٹن کے کپڑوں پر بلیچ سے بھی نہیں جاتے۔ مگر میں نہ پان چھوڑ سکتا ہوں اور نہ سفید کپڑوں کا موہ۔'' جواب دیتے ہوئے ان کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ اس بار نجمہ بھی اپنا تبسم نہیں روک سکیں۔''اچھا۔۔۔آپ منہ دھوئیے، میں چائے بناتی ہوں۔'' ''کیا عارف کا فون آیا تھا۔'' بیوی کے اُٹھنے سے پہلے انہوں نے دریافت کیا۔

''نہیں۔۔۔آج۔۔۔بھی۔۔۔نہیں آیا۔'' ''چلو میں ابھی ملاتا ہوں۔'' کہہ کر وہ اٹھ گئے اور نجمہ بھی باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔ عارف ان کا لڑکا تھا اور دوسرے شہر میں ایک بہت اعلیٰ اور معیاری سرکاری ادارے سے B.Tech کر رہا تھا اور یہ اس کا آخری سال تھا۔ اسی ادارے میں داخلے کا خواب تو انہوں نے اس کی اوائل عمری میں ہی دیکھا تھا مگر یہ یقین نہیں تھا کہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر بھی ہوگا، چوں کہ یہاں داخلے کے لئے ذہانت کے ساتھ قسمت بھی ضروری تھی۔ بہر حال یہ معرکہ فتح ہو گیا تھا جس کے عوض وہ بہت سرخرو ہوئے تھے۔

عارف حالاں کہ شروع سے ہی پڑھائی میں بہت تیز تھا۔ بعض لوگ پڑھنے میں تو بہت تیز ہوتے ہیں مگر زندگی کے دوسرے شعبوں میں ذہانت اُس طرح ساتھ نہیں دیتی، اس کے برخلاف عارف باقی معاملات میں بھی بہت حساس و ذہین تھا اور اس بات پر ماں، باپ ناز کرتے تھے۔ عارف نے جب اسکول جانا شروع کیا اور پڑھائی کی طرف اس کی غیر معمولی دلچسپی دیکھی تبھی فرید میاں نے طے کر لیا تھا کہ بچے کو انجینئر بنائیں گے۔ وہ ایک سرکاری دفتر میں بابو کی نوکری کر رہے تھے اور ملازمت سے سبک دوشی کا پورا ایک سال بچا تھا۔ تنخواہ بہت قلیل نہیں تھی مگر اتنی زیادہ بھی نہیں تھی کہ پیسوں کی فراوانی رہے۔ فنڈ کا پیسہ بھی نکال چکے تھے۔ نصف پیسہ بیٹی کی شادی میں خرچ ہو گیا اور باقی عارف کی پڑھائی میں لگ گیا بلکہ بینک سے لون (Loan) بھی لینا پڑا۔ ابا کا پشتینی مکان تھا جو انہیں مل گیا تھا جس سے کرائے سے بچ گئے۔ دال روٹی سکون سے چل رہی تھی۔ اب تو یہی سوچتے کہ اگلے سال عارف انجینئر بن کر آ جائے گا اور وہ ریٹائر ہو جائیں گے پھر بڑھیا، بڈھے گھر میں رہ کر پوتے پوتیوں کے ساتھ عیش کریں گے۔

انہوں نے تو یہاں تک سوچ لیا تھا کہ عارف کی شادی کے بعد کسی سے کہلوا دیں گے کہ صرف دو بچوں پر ہی قناعت نہ کرے۔ اس فیصلے سے بعد میں بہت پچھتاوا ہوتا ہے۔ گھر میں جتنے زیادہ لوگ ہوتے ہیں اتنی ہی رونق ہوتی ہے۔ یہ عذاب چوں کہ وہ خود جھیل رہے تھے اس لئے زیادہ احساس تھا کہ ان کے بیٹے کو یہ دن نہ دیکھنا پڑے۔ چائے وغیرہ سے فارغ ہوئے تو خیال آیا کہ عارف کو فون کرنا ہے۔ موبائل اٹھا کر اس کا نمبر ملانے لگے۔ پہلی بار میں فون نہیں اُٹھا وہ کچھ فکرمند ہوئے۔ یہ کلاس کا وقت بھی نہیں تھا۔ فوراً ہی دوبارہ ملایا۔ اس بار فون اُٹھ گیا۔ ''کیا حال ہے بیٹا۔۔۔خیریت۔۔۔تو ہے۔۔۔فون کیوں۔۔۔نہیں۔۔اُٹھایا۔۔۔؟ تم نے فون بھی نہیں کیا۔ ہم لوگ پریشان ہو رہے تھے۔''؟ ایک ساتھ اتنے سارے سوال کر ڈالے۔ عارف نے ان کے ہر سوال کا اطمینان بخش جواب دیا۔ پڑھائی کے متعلق بھی بات کی بعد میں ماں سے بھی گفتگو ہوئی۔ دونوں نے خوب ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ فون کا رابطہ منقطع ہونے کے بعد فرید میاں کچھ فکر مند سے دکھے۔ ''بیگم۔۔۔مجھے۔۔۔عارف کچھ پریشان کچھ لگ رہا ہے۔ تمہیں نہیں لگتا کہ اس کے لہجے میں آج وہ گرمی اور بشاشت نہیں تھی۔'' میاں کی بات پر بیوی نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں۔ شبہ تو مجھے بھی ہوا تھا پر میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ میرا وہم ہو۔'' ''والدین کو بچوں کے بارے میں وہم نہیں ہوتا لیکن اب کیا کیا جائے۔ دوبارہ فون کرنا مناسب ہوگا یا نہیں۔ اس بات پر غور و خوض ہونے لگا۔ طے یہ ہوا کہ ابھی فون نہیں کریں گے۔ وہ بھی پریشان ہو سکتا ہے۔ اس کے بارے میں کل استفسار کیا جائے گا۔

اپریل کے آخری دن چل رہے تھے۔ مغرب کی اذان میں ابھی وقت تھا۔ شام ڈھلنا شروع ہو چکی تھی۔ ان کا یہ وقت پیڑ پودوں کی دیکھ بھال کے لیے مختص تھا۔ ان کا گھر چوں کہ پرانی طرزِ تعمیر کا تھا۔ اس وقت زمین اتنی سکڑی ہوئی نہیں تھی۔ خوب بڑے بڑے کمرے، کشادہ صحن، جس کے کنارے انہوں نے کیاریاں بنالی تھیں۔ جس میں بہت سارے پودے لگے ہوئے تھے۔ گملے بھی خاصے ہو گئے تھے۔ کئی بیلیں چھت کی منڈیروں تک چڑھ گئی تھیں۔ کونے میں امرود کا ایک درخت جو عارف کی پیدائش کے آس پاس ہی لگایا تھا۔ اب تو خوب بڑا اور گھنا ہو گیا تھا۔ فصل کے دنوں میں امرودوں سے لدا رہتا۔ اتنے میٹھے امرود تھے کہ لوگ ہر بار تعریف کرنا نہیں بھولتے اور ساتھ میں حیرت کا اظہار بھی ہوتا کہ اس پیڑ میں کتنی برکت ہے۔ مہمانوں کو باندھ کر بھی دیے جاتے۔ آس پڑوس کے لوگ بھی لے جاتے مگر امرود تھے کہ کم ہی نہیں ہوتے۔ بعض اوقات تو فرید میاں بھی اوپر والے کا خصوصی فیضان سمجھتے حالاں کہ انہوں نے اپنے پیڑ پودوں کا خیال کسی بچے کی طرح ہی رکھا تھا مگر کسی شجر کے یہ کشف و کرامات صرف ان کے پسینہ بہانے کے عوض تو ممکن نہیں۔ باغبانی کا شوق فرید میاں کو بچپن سے ہی تھا۔ تجسس معلومات میں اضافہ ہی کرتا ہے۔ اب تو اتنا وقت گزر گیا تھا اس لئے ضرورت بھر کی معلومات انہیں حاصل ہو گئی تھی بلکہ وہ دوسروں کو بھی مشورے عنایت کرنے لگے تھے۔

موسم سرما میں کیاریاں رنگ برنگے پھول، پتیوں سے گلنار رہتیں۔ فرید میاں کے کلیجے کو ٹھنڈک پہنچتی۔ گرمی کے دنوں میں رات رانی اور بیلا اس قدر مہکتا کہ دور تک فضا معطر ہو جاتی۔ پوری گرمی بھر وہ صحن میں ہی سوتے اور کولر، اے سی میں سونے والوں کو کوستے۔ حلال رزق کمانے والوں کو تو نیند کہیں بھی آسکتی ہے مگر خوشبو دار پودوں کے ساتھ کھلے آسمان میں تاروں کو گنتے ہوئے سونے کا لطف اب کتنے لوگوں کو معلوم ہے۔

آج کی رات روز جیسی نہیں ہے۔ کچھ تبدیلی تو ہوئی تھی۔ عارف کی طرف سے وہ فکرمند تھے۔ کیا بات ہو سکتی ہے۔ ہم لوگوں سے چھپانے والی کیا کوئی بات عارف کے ذہن میں ممکن ہے۔ طرح طرح کے خیالات۔ ساتھ میں کچھ نامعلوم اندیشے۔ وسوسے بھی کہیں سچ میں یہ وہم تو نہیں مگر دل یہ آخری بات ماننے کو تیار نہیں۔ بہت رات تک بیگم سے ہر شک وشبہ پر بات کرتے رہے۔ دونوں ایک دوسرے کو دلاسہ دیتے رہے اور پھر جانے کب وہ نیند کی تاریک سرنگ میں داخل ہو گئے۔

صبح دیر سے آنکھ کھلی۔ دونوں کی فجر بھی قضا ہو گئی۔ اُٹھتے ہی پھر وہی موضوع۔ رات جہاں سے سلسلہ منقطع ہوا تھا دوبارہ شروع ہو گیا۔ ابھی تو وہ سو رہا ہوگا۔ رات دیر تک پڑھائی کرتا ہے اس لئے کلاس جانے کے وقت ہی آنکھ کھلتی ہے۔ اس وقت اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ سوچا کہ دفتر جانے کے وقت فون کریں گے تاکہ جانے سے قبل نجمہ بھی مطمئن ہو جائے اور وہ خود بھی۔ رات پودوں کو تو کسی طرح کھاد پانی دے دیا لیکن اس کے بعد کسی کام میں جی نہیں لگا۔ ذرا سی فرصت ملی تو احساس کی شدت بڑھنے لگی۔ جیسے تیسے دو گھنٹے اور گزر گئے۔ انہیں لگا کہ اب عارف اُٹھ گیا ہوگا۔ انہوں نے فون ملا کر اسپیکر (Speaker) آن کر دیا۔ رنگ ختم ہونے سے پہلے فون اُٹھ گیا۔ ''السلام علیکم۔۔۔ابّو۔۔'' عارف کی آواز آئی۔ دونوں نے ایک ساتھ وعلیکم السلام کہا۔ جو بات فرید میاں کو رات سے ہلکان کئے ہوئے تھے۔ آخر زبان پر آگئی۔ ''بیٹا سب۔۔۔خیریت۔۔۔تو۔۔۔ہے''۔ گلا کچھ روندھ سا گیا تھا۔ ''ہاں۔۔۔ابّو۔۔۔'' ''بیٹا شام کو تمہاری آواز میں کچھ تبدیلی تھی۔ ہم لوگوں کو فکر ہو گئی۔ تمہاری امی بھی پریشان ہو گئیں۔

''نہیں۔۔۔ابّو۔۔۔کوئی۔۔۔بات نہیں ہے۔۔بس یوں ہی ذرا سر میں درد ہے''۔ اس جملے کے بعد دونوں نے راحت کی گہری سانس لی۔ رات سے بگڑے ہوئے چہرے کے تاثرات خود بخود بہتر ہو گئے۔ دونوں نے خوب ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ خوب جی لگا کر پڑھنے کی تلقین کی۔ کسی طرح کی کوئی پریشانی یا ضرورت کی خبر ہمیں فوراً دینا''۔ عارف نے کہا ''ابّو مجھے کلاس کی دیر ہو رہی ہے۔۔۔پھر۔۔۔بات ہوگی۔۔۔انشاء اللہ۔۔۔السلام علیکم۔۔۔ اللہ۔۔۔حافظ۔۔۔'' فون ہاتھ میں لئے کچھ لمحوں تک دونوں وہیں کھڑے رہے۔ عارف کے جملوں کی بازگشت جیسے گونج رہی تھی۔۔۔''اچھا۔۔۔بیگم۔۔۔مجھے ناشتہ دو۔ میں بھی چلوں''۔

شام کو دفتر سے آنے کے بعد وہ اسی طرح آرام سے کرسی پر بیٹھے تھے کہ فون کی رِنگ ہوئی۔ انہوں نے فون اٹھا کر Caller کا نام دیکھا۔ ''بیگم عارف کا فون ہے''۔ نجمہ کو آواز دے کر فون ریسیو کر لیا۔ ''ہیلو۔۔۔بیٹا۔۔۔عارف'' ''آپ کون بول رہے ہیں''۔؟ ادھر سے آواز آئی۔ نجمہ بھی اب تک پاس آکر اسپیکر پر آواز سن رہی تھیں۔

''میں فرید اکرم۔۔۔بول۔۔۔رہا۔۔۔ہوں۔۔۔عارف کا فادر (Father)۔۔آپ کون۔۔۔اور عارف کہاں ہے''۔؟

''دیکھئے میں اس کے کالج کے پروفیسر رام چندرن بول رہا ہوں۔ اچانک عارف کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔ ہم اسے اسپتال لے جا رہے ہیں''۔

''آپ عارف سے میری بات کرائیے''۔ ان کے لہجے میں کرختگی در آئی تھی۔ نجمہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔

''دیکھئے۔۔۔وہ اس وقت آپ سے بات کرنے کی Position میں نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو یہاں آجانا چاہئے۔ اور فون کٹ گیا۔ ان کے پیروں کے نیچے سے زمین یقیناً

سرک گئی تھی۔ انہوں نے فوراً Call back کیا۔ فون نہیں اُٹھا۔ دوبار۔۔۔تین۔۔۔بار۔۔۔چار۔۔۔بار آخر فون ان کے ہاتھ میں لرزنے لگا۔ اس کے باوجود وہ بار بار کوشش کرتے رہے۔ اب Switch off بتانے لگا۔ اب تک آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہو چکے تھے نجمہ کا بھی برا حال تھا۔ انہوں نے کالج انتظامیہ کو فون ملایا بڑی مشکل سے وہاں فون تو اٹھا مگر کوئی خاطر خواہ جواب نہیں ملا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ ہوا۔۔۔کیا ہے۔۔۔میرے۔۔۔عارف۔۔۔کو؟ نظر کے سامنے ایسے خدشات تیر رہے تھے جن کے نام بھی ذہن سے جھٹک دیتے۔ اللہ اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ چُولیں تو فرید میاں کی درک گئی تھیں۔ پیروں پر جسم کا بوجھ اُٹھانے کی طاقت بھی جیسے ختم ہو رہی تھی۔ سامنے ایک ماں بھی حواس باختہ سی کھڑی تھی۔ انہیں اپنے جذبات پر بہت قابو رکھنا تھا ”بیگم۔۔۔ہمیں ابھی نکلنا پڑے گا“ کہتے کہتے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا کسی طرح بیٹی کو فون کیا۔ وہ اسی شہر میں تھی تھوڑی ہی دیر میں شوہر کے ساتھ ایک چھوٹا سا بیگ لے کر آگئی۔ بیٹی کو دیکھتے ہی ماں کا اتنی دیر سے روکا ہوا صبر وضبط کا بند ٹوٹ کر بہہ نکلا۔ وہ پچھاڑتے مار کر گر پڑیں۔

داماد نے ریل کی تفصیلات معلوم کیں اور تتکال میں E.Ticket بُک کرا دیا۔ پرنٹ بھی مل گیا۔ دو گھنٹے بعد گاڑی تھی۔ سفر کی کچھ تیاری تو کرنی ہی پڑتی ہے خواہ سفر چاہے جس نوعیت کا ہو۔ داماد نے ٹکٹ کے متعلق انہیں بتا دیا اور ساتھ میں یہ بھی اطلاع دے دی کہ آپ لوگ پیسوں کی فکر نہ کریں۔ پیسے میرے پاس ہیں اور A.T.M. بھی ہے۔

تمام رات کا سفر طے کر کے وہ وہاں پہنچ گئے۔ رات بھر چاروں میں سے کوئی نہیں سویا۔ سب نظریں بچا کر ایک دوسرے کا جائزہ لے رہے تھے۔ خامشی کا اس قدر شور زندگی میں ایک آدھ بار ہی سننے کو ملتا ہے۔ لگ رہا تھا جیسے وہ برسوں سے ٹرین میں سوار ہیں اور ریل کہیں گہری سرنگ میں پھنس گئی ہے۔

سورج طلوع نہیں ہوا تھا مگر آمد کی اطلاع آ گئی تھی اور اسی کے ساتھ گاڑی پلیٹ فارم سے لگ گئی۔ وہ گرتے پڑتے باہر نکلے اور تقریباً دوڑتے ہوئے اسٹیشن سے باہر آئے۔ ٹیکسی والے سے کالج کا نام لیا۔ اس نے دوسو روپے مانگے وہ لوگ دروازے کھول کر اندر ہوئے۔ بھڑاک سے دروازے بند ہوئے اور بجلی کی سی تیزی سے گاڑی سڑک پر دوڑنے لگی۔ فرید میاں نے ڈرائیور سے درخواست کی ”بھیا۔۔۔تم۔۔۔جتنی جلدی ہو سکے ہمیں پہنچا۔ ہم تمہیں اور پیسے دے دیں گے“۔ یہ سن کر اس نے رفتار اور بڑھا دی۔ معاملے کی نزاکت وہ بھانپ گیا تھا اور واقعی میں بہت کم وقت میں انہیں کالج کے اندر پہنچا دیا۔ اس نے زائد پیسے یہ کہہ کر واپس دیے ”نہیں صاحب۔۔۔آپ لوگ کسی پریشانی میں لگ رہے ہیں۔۔۔اور وہ گاڑی لے کر نظر سے اوجھل ہو گیا۔ اس وقت کسی اور کے بارے میں سوچنے کا وقت تھا اور نہ محل۔ دروازے پر خاصی تعداد میں پولیس کا عملہ نظر آیا۔ خدشات کے سائے بڑے ہونے لگے۔ وہ لفظ جن سے وہ شام سے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کر رہے تھے، ایک پولیس افسر نے قریب آ کر اُن سے کان میں پگھلے شیشے کے ساتھ انڈیل دیا۔ ”آپ۔۔۔عارف۔۔۔کے۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔میں۔۔۔باپ۔۔۔ہوں۔۔۔یہ ماں۔۔۔اور یہ بہن بہنوئی۔۔۔عارف کہاں۔۔۔ہے۔۔۔؟“

”He-is-no more۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اس نے دوپہر تین بجے خودکشی کر لی۔“ افسر کی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔ فرید اور نجمہ تو گر ہی پڑے۔۔۔رو رو کر برا حال تھا۔ مجھے میرے بچے کے پاس لے چلو“ وہ دہاڑے مار کر رو رہے تھے۔ کالج کا عملہ بھی موجود تھا۔ طالب علم بھی کثیر تعداد میں Campus میں نظر آ رہے تھے۔ ایک سوگواری کا ماحول پوری فضا پر قائم تھا۔ کچھ دیر میں انہیں اس اسپتال لے جایا گیا جہاں عارف کی لاش رکھی تھی۔ رات میں ہی اس کا پوسٹ مارٹم ہو گیا تھا۔ ساری رپورٹز اور ضروری کاغذات پولیس نے ان کے حوالے کر دیئے۔ بہت دیر بعد فرید میاں کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی ”ایسی۔۔۔کیا۔۔۔وجہ تھی۔۔۔جو اسے خودکشی کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ پولیس افسر مسلمان تھا۔ اس نے بتایا کہ ابھی تک کی تفتیش جو نتائج سامنے آئے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ وہ پڑھائی کے بوجھ سے ڈپریشن میں تھا۔ پچھلے سیمسٹر میں اس کا ایک پرچہ خراب ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ ڈسٹرب تھا۔ ہم نے اس کے دوستوں سے بھی بات کی ہے۔ وہ بہت اچھا لڑکا تھا مگر ایسے اداروں میں خودکشی تو پڑھنے ہی والے کرتے ہیں چوں کہ مستقبل کے بارے میں والدین کی توقعات بہت زیادہ ہو جاتی ہیں۔“ وہ بہت رُک رُک کر بول رہا تھا۔ اور لوگوں کے پاس جو بھی معلومات تھیں سب انہیں بتا رہے تھے سب میں یہ ایک بات مشترک تھی کہ عارف بہت ذہین، حساس اور سنجیدہ لڑکا تھا۔ اتنے ذہین لوگ ڈپریشن میں آ ہی جاتے ہیں“۔ رونے والوں کے پاس آنسو ختم ہو گئے۔ کالج اور پولیس کی تمام کاغذی کارروائی سے نمٹ کر اب انہیں واپس ہونا تھا۔ ایک ٹیکسی کا بندوبست کیا گیا اور وہ ایک بڑے تعلیمی ادارے سے والدین کا روشن خواب برف کی سلی پر لٹا کر واپس لوٹ گئے۔

لاش جب اپنے شہر پہنچی تو جس نے سنا ان کے گھر کی طرف دوڑ پڑا۔ ذرا ہی دیر میں وہاں جم غفیر نظر آنے لگا۔ کیا اپنے۔ کیا۔۔۔غیر۔۔۔سب کی آنکھیں نم تھیں۔ نجمہ تو بالکل سکتے کے عالم میں ایک کونے میں پڑی ہوئی تھیں۔ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ آخری رسومات بھی ادا ہو گئیں۔ جنازے میں جیسے پورا شہر اُمڈ آیا ہو گھر کے در و بام میں اگربتی، لوبان اور کافور کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ رشتے اور تعلق کے لحاظ سے وقت دے کر آگے پیچھے تمام لوگ رخصت ہو گئے۔ فرید اکرام کا وہ گھر جو ایک ہفتہ پہلے خوشیوں کا گہوارہ ہوا کرتا تھا آج ایک اُجالا بے رونق، ویران مکان میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ایک ہفتہ میں فرید اور نجمہ برسوں کے بیمار نظر آنے لگے تھے۔ آنکھوں کے اردگرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ گال بھی پچک گئے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو اب تسلی و تشفی نہیں دے پا رہے تھے۔

ایک اور شام زوال کے درپے تھی۔ سورج رختِ سفر سمیٹ رہا تھا، سیارے، سماوات اپنی گردش میں تھے۔ اس گھر کے علاوہ کہیں کسی پر اب کوئی فرق نظر نہیں آ رہا تھا۔ دونوں صحن میں کرسیوں پر آمنے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ وقفے سے ادھر اُدھر دیکھ لیتے اور پھر آسمان کی طرف نظر اُٹھ جاتی۔ اچانک فرید میاں کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی ”نجمہ۔۔۔وہ۔۔۔دیکھو۔۔۔اپنا۔۔۔امرود۔۔۔کا۔۔۔پیڑ۔۔۔“ نجمہ نے آہستگی سے گردن اس طرف گھمائی۔۔۔کچھ وقت ضرور لگا مگر اُن کی بھی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ خشک ٹہنیوں کے ساتھ ایک موٹا سا تنا زمین میں دھنسا ہوا تھا۔ اسے دیکھ لگ رہا تھا کہ شاید اس پر کبھی ایک ہرا پتہ بھی نہیں نکلا۔ جیسے کسی نے اس کی جڑ میں تیزاب ڈال دیا۔۔۔ہو۔۔۔“؟

□□□

سراج فاروقی

پنویل، رائے گڑ، نوی ممبئی

8108894969

افسانہ

روح کا تبسم

''اِس بار بہت دنوں بعد آئے؟'' شکیلہ کی آواز میں ہلکی کپکپاہٹ تھی، جیسے ماضی کی یادوں نے اس کے لہجے کو تھام رکھا ہو۔''ہاں...!'' ہارون نے ذرا تھک کر کہا،''بہت مصروفیات تھیں۔''

بوڑھے ہارون کی آواز میں وہی نرمی تھی جو کبھی اس کے بچپن کے وعدوں میں ہوا کرتی تھی، مگر اب اس میں تھکن اور وقت کی دھول بھی شامل تھی۔''اُس بار بہت جلدی چلے گئے تھے،'' شکیلہ نے مسکراہٹ کے ساتھ کہا، مگر اس مسکراہٹ میں عمر بھر کی محرومیوں کا ملال چھپا ہوا تھا۔شکیلہ اُس کے گاؤں کی وہی لڑکی تھی، جو کبھی کھیتوں کے کنارے، ندی کے پانیوں میں چاند کی جھلک دیکھ کر ہارون کا نام زیرِلب گنگناتی تھی۔بچپن سے ہی ان کے دل ایک دوسرے کے نام لکھے جا چکے تھے، مگر تقدیر کی لکیر نے ان کے راستے جدا کر دیے۔آج دونوں عمر کے اس موڑ پر کھڑے تھے جہاں سانسیں ہانپتی ہیں، مگر یادیں جوان رہتی ہیں۔وقت نے ان کے بالوں کو سفید، مگر محبت کو تابناک کر دیا تھا۔ان کے چہروں کی جھریوں میں ماضی کے خواب بستے تھے، اور ان کی آنکھوں میں وہی پرانی چمک تھی ۔۔۔۔۔وہ چمک جو برسوں پہلے ایک نیم کے درخت کے نیچے روشن ہوئی تھی۔اِن دنوں، وہ دونوں اپنی اپنی اولاد کے ماں باپ تھے، لیکن ان کے دلوں میں اب بھی وہی بچپن کی نادان چاہت، وہی خاموش اضطراب، وہی چھپی ہوئی سوزش، کسی ٹھنڈی راکھ میں سلگتی چنگاری کی طرح زندہ تھی۔شکیلہ کی شادی گاؤں ہی کے ایک نوجوان سے ہوگئی تھی۔ہارون ایک دن شہر گیا۔۔۔ اور پھر شہر ہی کا ہوگیا۔مگر محبت ...وہ تو کہیں گئی ہی نہیں۔۔۔۔ وہ دل کے کسی گوشے میں منجمد ہو کر، ایک خاموش، سانس لیتی یاد بن کر رہ گئی تھی۔

جب بھی ہارون گاؤں آتا، وہ دونوں ملتے۔لمبی باتیں ہوتیں، چھوٹی مسکراہٹیں، اور ایک دوسرے کے وجود میں شکر گزاری کی مٹھاس۔ان کی نگاہیں بولتی تھیں، زبانیں خاموش رہتی تھیں۔وہ کبھی کچھ نہ کہتے، کسی کو شک نہ ہونے دیتے، مگر دل کے اندر کا طوفان ہر بار تھوڑا سا اور بڑھ جاتا۔رفتہ رفتہ وہ دونوں دو دریاؤں کی مانند ہو گئے۔۔۔۔ کبھی کسی موڑ پر ملتے، اور پھر زندگی کے دھارے میں بہہ کر دور نکل جاتے۔''ہاں...!''

ہارون نے شکستہ دلی سے جواب دیا، جیسے ماضی کی کوئی یاد ابھی ابھی اس کے دل میں تیر گئی ہو۔شکیلہ نے آہستگی سے پوچھا،''اِس بار زیادہ دنوں کا قیام ہوگا؟'' اس کی آواز میں امید بھی تھی اور اندیشہ بھی۔ہارون نے ذرا ٹھہر کر کہا،''ہاں...!'' اور جب اس نے شکیلہ کی آنکھوں میں دیکھا۔۔۔۔ تو اسے لگا کہ وقت نے صرف ان آنکھوں کو کمزور کیا ہے، محبت کو نہیں۔محبت وہاں اب بھی شاداب تھی، ہری بھری، جیسے برسات کی پہلی بوند کے بعد زمین مسکرائے۔ہارون کے دل میں ایک نرم سا سکون اترا۔۔۔۔ محبوب کو اور کیا درکار ہوتا ہے؟

اس کے لیے تو یہی لمحہ سب کچھ ہوتا ہے کہ وہ محبوب کو دیکھ سکے، اور اس کے چہرے کی روشنی میں اپنی عمر کی شام گزار دے۔شکیلہ نے بات بدلی،''چلو، اچھا ہے۔میری پیٹ پوچھنی کی شادی میں شامل ہو جاؤ گے۔۔۔۔اُس بار آئے تھے تو لڑکے کی شادی کو ایک دن باقی تھا، اور تم گئے تھے۔'' اس کے چہرے پر ہلکی لرزش آئی، بوڑھی آنکھوں میں پرانی شکایت کی نمی تیر گئی۔

ہارون نے اسے غور سے دیکھا، اس کے کرب کو محسوس کیا، اور دھیرے سے بولا،

''بہت ضروری کام تھا ... اور ٹکٹ بھی نکلی ہوئی تھی، اس لیے جانا پڑا۔'' شکیلہ نے مسکرا کر کہا، ''جانتی ہوں۔'' اس کی مسکراہٹ میں گلہ بھی تھا اور قبولیت بھی ۔۔۔۔۔ وہ لکڑی کے سہارے ذرا جھک کر کھڑی تھی، اور ہارون نیم کے بوڑھے تنے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ نیم کے پتے ہلکی ہوا میں سرسرا رہے تھے، جیسے ماضی کے سارے وعدے ہوا کے دوش پر پھر سے سرگوشیاں کرنے لگے ہوں۔

ہارون کا بچپن سے یہ معمول تھا کہ وہ روز اسی نیم کے درخت کے پاس آ بیٹھتا۔ کبھی کھیلنے کے بہانے، کبھی تنہائی کے سبب۔ یہ نیم کا درخت بستی سے ذرا ہٹ کر ایک ایسی جگہ ایستادہ تھا جہاں ہوا صاف تھی، اور سامنے قبرستان کی خاموشی اس کے وجود میں عجب ٹھہراؤ پیدا کرتی تھی۔ دور تک کھلا میدان پھیلا تھا ۔۔۔۔ جس میں چھوٹی بڑی، پختہ و نیم پختہ، پرانی و نئی قبریں یوں بکھری تھیں جیسے وقت کے صفحے پر کسی نے کہانیاں لکھ کر چھوڑ دی ہوں۔ کہیں کہیں چند مویشی بے نیازی سے چر رہے تھے ۔۔۔۔ گردنیں جھکائے، آہستہ آہستہ جگالی کرتے ہوئے ۔۔۔۔ یوں جیسے انہیں نہ ماضی کی خبر ہو، نہ حال کی پروا، بس زمین کی سانس اور گھاس کی مہک سے اپنا رشتہ نبھا رہے ہوں۔ کبھی کہیں کوئی آم کا درخت اپنے ہرے پتوں میں ماضی کی خوشبو بکھیرتا، کہیں مہوے کے تنے سے ہلکی مٹی کی باس اٹھتی، اور کہیں ببول کے کانٹے زمین کی ویرانی میں یادوں کا کانٹا بن کر چبھتے۔ کہیں رُوسوں کے سبز پتوں پر کوئی یاد تازہ ہو کر چمکتی۔ ان سب کے درمیان وہی ایک پرانا نیم کا درخت کھڑا تھا ۔۔۔۔ جیسے صدیوں سے وقت کی نبض پر انگلی رکھے یہ سب کچھ دیکھ رہا ہو۔ اس کی شاخیں چاروں سمت پھیلی تھیں؛ شاخوں پر طوطے، کیلاٹھی، کوے اور بگلے بیٹھے اپنے اپنے سُر الاپ رہے تھے۔

زندگی اور موت کے بیچ ایک مسلسل ترنم جاری تھا۔ ہارون نے شکیلہ کو دیکھا جو لکڑی کے سہارے کھڑی تھی، ہلکی ہوا میں اس کی دوپٹے کا پلو ہوا میں اڑ رہا تھا۔ اس نے نرمی سے کہا، ''بیٹھ جاؤ، تھک جاؤ گی۔'' شکیلہ نے ادھر ادھر دیکھا ۔۔۔۔ دور کہیں بچے نہر کی طرف دوڑتے جا رہے تھے، کچھ عورتیں سروں پر گھڑے رکھے لوٹ رہی تھیں۔ اس نے وہیں زمین پر بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔ زمین نم تھی، گھاس کے تنکے نرم و تر، اور یہاں وہاں نیم کی کڑوے ذائقے والی چھوٹی کوڑیاں بکھری پڑی تھیں ۔۔۔۔ کچھ تازہ، کچھ سوکھی، جیسے وقت نے نیم کے پتوں کے ساتھ اپنی یادیں بھی جھاڑ دی ہوں۔

اس وقت فضا میں ایک عجیب سا سکوت تھا ۔۔۔۔ نہ مکمل خاموشی، نہ شور ۔۔۔۔۔ بس پنچھیوں کی بولیاں، اور کہیں دور سے آتی بیل کے گلے میں بجتی گھنٹیوں کی مدھم آوازیں۔ تھوڑی دیر بعد ہارون نے متانت سے پوچھا، ''کب شادی ہے؟'' شکیلہ نے ہلکی سی سانس لی، ''انتیس کو۔'' ہارون نے دوبارہ پوچھا، ''اسی ماہ؟'' ''ہاں، اسی ماہ۔'' اس کی آواز میں ایک سادگی تھی، مگر وہ سادگی ہارون کے دل پر کسی لمحے کی طرح آ گری ۔۔۔۔ ٹھنڈی مگر چبھتی ہوئی۔ ہارون کے دل میں ایک لمحے کو جھٹکا سا لگا۔ اس کی ٹکٹ اٹھائیس تاریخ کی تھی ۔۔۔۔ یعنی جدائی ایک دن پہلے لکھی جا چکی تھی۔ محبوب کو ہمیشہ وقت سے ہارنے کا غم سب سے زیادہ چبھتا ہے۔ وہ چاہتا تھا کچھ نہ کہے، کیونکہ جدائی کا ذکر بھی جدائی کی شدت بڑھا دیتا ہے۔

اس نے دھیرے سے کہا، ''ٹھیک ہے ...'' مگر دل میں اس نے فیصلہ کر لیا ۔۔۔۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے، وہ اس بار ضرور رکے گا، اس وعدے کو پورا کرے گا، جو کبھی زبان سے کہا نہیں، مگر دل میں ہمیشہ بولا گیا۔ شکیلہ نے جیسے اس کے دل کا حال پڑھ لیا ہو۔ اس کے چہرے پر ایک ایسی مسکان اُبھری ۔۔۔۔ جو لفظوں کی دسترس سے باہر تھی۔ چاندنی جیسی نرم، گلاب کے کھلنے جیسی شاداب، جیسے روح کے کسی نہاں گوشے میں بہار اتر آئی ہو۔ یہ مسکان نہ صرف ہارون کے دل میں اُتری بلکہ فضا میں بھی بکھر گئی ۔۔۔۔ ہوا کے لمس میں شیرینی گھل گئی، اور شام کے سورج کی کرنیں نیم کی پتیوں سے چھن کر دونوں کے چہروں پر ایک نورانی چمک ڈالنے لگیں۔

یہ مسکان دو دلوں کے ملاپ کی نہیں تھی ۔۔۔۔ یہ تو جدائی کے بیچ بھی محبت کے زندہ ہونے کا اعلان تھی۔ یہ اُن دو روحوں کی گواہی تھی جو نہ مل کر بھی ایک دوسرے میں مکمل تھیں۔ محبت کے کچھ لمحے ایسے ہوتے ہیں جنہیں بیان نہیں کیا جا سکتا، بس محسوس کیا جا سکتا ہے ۔۔۔۔ اور اس لمحے وہی کیفیت تھی۔ ہوا، نیم، دھوپ، مٹی ۔۔۔۔ سب ان کی خاموش محبت کے گواہ بن گئے تھے۔

زندگی کا سچا سکھ صرف کچھ پا لینے میں نہیں ہوتا ۔۔۔۔ کبھی کچھ نہ پانے میں بھی ایک نایاب سرور چھپا ہوتا ہے۔ محبوب کی ایک معمولی سی چیز بھی عاشق کے لیے گویا کائنات بن جاتی ہے۔ ہارون نے آہستگی سے کہا، ''یاد ہے شکیلہ؟ وہ دن ... جب ہم یہیں تیورا اور گٹّی کھیلا کرتے تھے؟ اکثر میں ہار جاتا تھا ... اور تم ہنستی ہوئی جیت جاتی تھیں۔'' شکیلہ کے چہرے پر ایک لطیف تبسم اُترا ۔۔۔۔ وہ تبسم جس میں ماضی کی خوشبو، وقت کی تھکن، اور بچپن کی معصومیت کا جادو گھلا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کی جھریوں میں ایک لمحے کو جوانی کی لالی لوٹ آئی ۔۔۔۔ گویا وہ اپنی گزر چکی بہار کو پلکوں سے چھو رہی ہو۔ ''ہاں ہاں! یاد ہے ۔۔۔۔!'' اس نے جیسے کسی دور کے خواب کو چھوا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی، مگر آنکھوں میں وہی پرانا درد ۔۔۔۔ جو خوشی کے بھیس میں محبت کا خراج بن کر ابھرتا ہے۔ ہارون نے کہا، کیا وہ پل تھا، شکیلہ؟'' اور اس کی نظریں نیم کی شاخوں سے ہوتی ہوئی آسمان کے نیلے گنبد کو چھونے لگیں۔ وہ جیسے خیالوں کے بادلوں میں تیرنے لگا تھا۔

''ہاں، سچ ۔۔۔۔!'' شکیلہ نے کہا، اور اس کے چہرے پر ایک نورانی چمک چھا گئی ۔۔۔۔ جیسے یادوں نے اس کے وجود کو پھر سے جوان کر دیا ہو۔ ''زندگی کتنی تیز رفتار ہے،'' ہارون بولا، ''ایسا لگتا ہے جیسے کل ہی ہم جوان تھے، اور آج دیکھو ۔۔۔۔ بڑھاپا ہمارے کندھوں پر ہاتھ رکھے کھڑا ہے۔'' اس کی آواز میں افسوس نہیں، حیرت تھی ۔۔۔۔ وقت کی اس نرمی پر جو لمحوں کو صدیوں میں بدل دیتا ہے۔

شکیلہ خاموشی سے کھیتوں کی طرف دیکھنے لگی۔ دور تک سنہری لہریں ہل رہی تھیں، ہوا میں پکی فصلوں کی خوشبو گھل رہی تھی۔ اس نے کہا، ''سچ کہتے ہو تم ۔۔۔۔!'' اور پھر جیسے وقت کا پردہ ہٹا ۔۔۔۔ اسے وہی پرانی صبح یاد آ گئی ۔۔۔۔ کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر دو چھوٹے پاؤں، ہنسی کے چھینٹے، بھاگتے دوڑتے لمحے۔

سرسوں کے کھیتوں میں تتلیاں ناچ رہی ہیں، کوئل اپنی مدھم کوک سے فضا کو بھرتی

ہے، اور بھنورے پھولوں سے لپٹ لپٹ کر مدھو چُن رہے ہیں۔ ندیوں کے پانیوں میں آسمان جھلک رہا ہے، اور نالوں میں قل قل کرتی زندگی بہہ رہی ہے۔ یہ منظر شکیلہ کی آنکھوں میں اُترا تو وہ بھیگ گئیں۔

ہارون نے نرمی سے کہا، ''کیا حسین پل تھا وہ، شکیلہ؟'' شکیلہ کے ہونٹ لرزے،

''سچا جیون تو وہی تھا، ہارون، وہی پل... جو کبھی ٹھہرا نہیں۔''

اس کے لہجے میں ایسی گہرائی تھی کہ جیسے عمر بھر کی تھکن ایک سانس میں سمیٹ لی ہو۔ ہارون نے ایک گہری سانس لی، ''ہاں۔۔۔!'' اور دونوں کے درمیان ایک خاموش سا اعتراف تیر گیا۔۔۔۔ جیسے محبت اپنی آخری منزل کی طرف بڑھ رہی ہو۔ کچھ دیر بعد ہارون نے کہا، ''شکیلہ... ہم زندگی میں مل نہ سکے، مگر میرا یقین کہتا ہے۔۔۔۔ ہم مرنے کے بعد ضرور ملیں گے۔ کیا تمہیں نہیں لگتا؟'' اس کی آنکھوں میں مایوسی نہیں، ایک روحانی یقین تھا۔ شکیلہ نے دائیں بائیں نظریں دوڑائیں۔۔۔۔ فضا میں نیم کے پتّے ہلکے سے جھوم رہے تھے، جیسے اس خیال کی تائید کر رہے ہوں۔ ''ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو، ہارون، میرا بھی یہی خیال ہے، محبت کبھی مرتی نہیں... بس روپ بدل لیتی ہے۔''

ہارون نے نیم کے نیچے زمین کی طرف دیکھا، جہاں سورج کی کرنیں چھن چھن کر روشنی کے چھینٹے ڈال رہی تھیں۔ وہ اٹھا، آہستہ سے آگے بڑھا، اور انگلی سے مٹی کی ایک جگہ دکھاتے ہوئے بولا، ''دیکھو شکیلہ، یہاں... یہاں کوئی دفن نہیں۔ یہ جگہ خالی ہے، نیم کی ٹھنڈی چھاؤں بھی ہے۔ ہم دونوں یہیں دفن ہوں گے۔۔۔۔ ساتھ ساتھ۔ ٹھیک ہے؟'' شکیلہ نے لرزتی آواز میں کہا، ''ہاں... بالکل ٹھیک۔ مجھے پوری طرح اتفاق ہے۔ اور تم بھی اپنے گھر والوں کو وصیت کر دینا۔'' اس کے لہجے میں جذبات کی گرمی تھی، جیسے دل نے زبان سے آگ بن کر نکلنے کی کوشش کی ہو۔

ہارون بولا، ''ہاں، بالکل درست... میں جہاں بھی مروں، دفن اپنی دھرتی میں ہی ہوں گا۔ یہ میری وصیت ہے... بس اب جگہ بھی بتا دوں گا۔'' شکیلہ کی آنکھوں میں نمی تیر گئی، اس نے دھیرے سے کہا، ''ہاں، ضرور بتا دینا، ہارون... ضرور۔'' ہوا میں نیم کے پتّے سرسرانے لگے۔۔۔۔۔ جیسے روحیں سن رہی ہوں۔ ہارون نے آسمان کی طرف دیکھا، کون جانے، مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟ شاید... اگر کوئی اور زندگی ہوئی۔۔۔۔ تو ہم دونوں پھر ملیں گے، اسی جگہ، اپنی اپنی قبروں کے پاس، بیٹھ کر پرانی باتیں کریں گے، محبت کے گیت گائیں گے، اور اپنی حسرتوں کا قرض چکا دیں گے۔''

شکیلہ کی آنکھوں میں ایک خواب اتر آیا۔ ''سچ، ہارون... وہ پل کتنا حسین ہوگا، جب ہم دوسری دنیا میں ملیں گے، اور محبت کے گیت گائیں گے۔'' وہ خیالوں میں دیکھ رہی تھی۔۔۔۔ چاندنی رات ہے، دونوں نورانی لباسوں میں اپنی اپنی قبروں سے نکلتے ہیں، فضا میں ایک نیم شفاف روشنی تیر رہی ہے، وہ کھیتوں، باغوں، ندی کناروں پر گھوم رہے ہیں، ہاتھوں میں ہاتھ، بانہوں میں بانہیں ڈالے، فضاؤں میں اڑتے ہوئے۔ محبت کے اُس جہاں میں جا بسے ہیں جہاں جدائی کا کوئی مفہوم نہیں۔ نیم کی شاخوں سے ایک پتّا ٹوٹا۔۔۔۔۔ ہوا نے اسے تھام لیا، اور وہ دونوں کے درمیان آ گرا۔۔۔۔۔ جیسے فطرت نے ان کے ابدی وعدے پر مہر لگا دی ہو۔

وصالِ روح

چاندنی کی نرم تہہ میں دونوں روحیں اب بھی فضاؤں میں تیر رہی تھیں۔ وقت تھم سا گیا تھا، اور فضا میں محبت کے سرمدی نغمے گونج رہے تھے۔ مگر آہستہ آہستہ وہ چاندنی مدھم ہونے لگی۔ فضا کی شفاف روشنی میں جیسے کوئی دور سے پکارا ابھرنے لگی۔۔۔۔۔۔۔ پہلے دھیمی، پھر کچھ قریب، پھر اور قریب۔۔۔۔۔ ایک مانوس، کومل، زمینی صدا، ''امّی۔۔۔۔! امّی۔۔۔۔۔۔۔!'' یہ آواز جب شکیلہ کے کانوں سے ٹکرائی، تو اس کے خیالوں کا شیش محل لرزنے لگا۔۔۔۔۔ جیسے کسی نے نرمی سے اس کے خواب کی شاخ کو ہلا دیا ہو۔

وہ دوسری دنیا کے نور سے نکل کر آہستہ آہستہ اس زمینی روشنی میں واپس آئی۔ فضا کی نرمی بدلنے لگی، اور اسے احساس ہوا۔۔۔۔۔ وہ اب نیم کے نیچے، اسی مٹی پر ہے، جہاں سے سب خواب اُڑے تھے۔ اس نے پلکیں کھولیں تو دیکھا، اس کی بیٹی سامنے کھڑی ہے، ہتھیلیاں مَلتی، جھجکتی، اور آنکھوں میں خفیف سا عجز و لاچاری لیے۔ ''کیا ہوا؟''

شکیلہ نے شکن زدہ لہجے میں پوچھا۔ آواز میں وہی بے چینی تھی جو کسی خواب کے ٹوٹنے پر آتی ہے۔ ''ابّا بُلا رہے ہیں۔۔۔۔۔۔۔!'' بیٹی نے قریب آتے ہوئے کہا۔ شاید وہ جانتی تھی کہ اس کی آمد نے ماں کے تصور میں خلل ڈال دیا ہے۔ شکیلہ نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی، پھر ہارون کی طرف پلٹ کر مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ''یہی میری پیٹ پوچھنی ہے۔۔۔۔'' اور پھر بیٹی سے تعارف کراتے ہوئے بولی، ''اسی کی شادی ہے۔''

لڑکی نے سر جھکا کر ادب سے سلام کیا، پھر چہرے پر ہلکی لالی لیے نظریں پھیر لیں۔ جیسے کلی ہوا سے لپٹ کر بند ہو جائے۔ ہارون نے نرمی سے جواب دیا، ''خوش رہو، بیٹی۔ تمہاری قسمت روشن ہو۔'' پھر شکیلہ کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا، ''بالکل تمہاری شبیہ ہے۔ وہی چمک، وہی نرمی، وہی وقار۔'' شکیلہ کے چہرے پر ہلکی سی روشنی پھیل گئی، جیسے دل کی کسی کھڑکی سے دھوپ اندر آئی ہو۔ وہ بیٹی سے بولی، ''تُو چل، میں آتی ہوں۔'' بیٹی دھیرے قدموں سے چلی گئی۔ اس کے دوپٹے کے پلو ہوا میں لہرائے، پھر فضا میں مدھم ہو گئے۔

شکیلہ بھی آہستہ سے اٹھی، لکڑی ٹیکتی چند قدم چلی، پھر مڑ کر رکی۔۔۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں میں نمی، اور لبوں پر وہی تھکی مگر پیاری مسکراہٹ۔ ''تو کیا، ہارون... ہم واقعی دوسری دنیا میں ملیں گے؟'' اس کی آواز ہوا کے لمس سے بھی نرم تھی۔ ہارون نے نگاہ اٹھائی۔۔۔۔۔ آنکھوں میں یقین کی روشنی اور سکون کا تبسم تھا۔ ''ہاں، شکیلہ... ضرور۔ ہم ضرور دوسری دنیا میں ملیں گے۔۔۔۔۔ جہاں نہ وقت ہوگا، نہ جدائی۔'' شکیلہ نے نگاہ جھکائی۔ اس کے پژمردہ چہرے پر ایک دلآویز مسکراہٹ کھل گئی، جیسے خزاں میں گلاب مہک اٹھا ہو۔ وہ لکڑی ٹیکتی ہوئی، ہولے ہولے آگے کا سفر طے کرنے لگی۔ نیم کے پتّے سرسرا اُٹھے، ہوا میں ایک خوشبو سی تیر گئی۔ ڈھلتے سورج نے نیم کی شاخوں سے چھن کر زمین پر سنہری داغ ڈال دیے۔ فضا میں ایک نرمی، ایک خاموش چمک پھیل گئی۔۔۔۔۔۔۔ اور کہیں قریب، کسی نہ دِکھنے والے آسمان پر محبت کی ایک لطیف مُسکراہٹ چمکی۔۔۔۔۔ روح کا تبسم۔

❑❑❑

نصرت شمسی

انجمن اسٹریٹ، این این، رامپور

9045380276

افسانہ

چھن

اس نے اس کے کان کا جھمکا ہلایا اور اسے قریب کرنے کی کوشش کی۔

''کتنی حسین لگتی ہے تو، جب یہ جھمکے پہنتی ہے۔ تیری سی چمکتی ہوئی زلفیں اور گالوں کو چھوتی لٹیں اور ہلتے ہوئے جھمکے، قریب آنا۔''

رانو کا دل بہت زور سے دھڑکا اور وہ شبن سے دور ہوگئی۔

''ہٹ پیچھے۔''

رانو نے بکھرے ہوئے بال سمیٹے جنھیں تین دن سے کنگھا نصیب نہ ہوا تھا اور شبن کی طرف مڑ گئی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ شبن اس کے لیے کچھ لایا ہے۔

''دکھا، ہاتھ میں کیا چھپایا ہے؟''

رانو نے اس کے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا۔

''ہوں..... ایسے ہی دکھا دوں؟ پہلے کچھ باتیں تو کر لے۔ وہ باتیں جو فلموں میں ہیرو ہیروئن سے کرتا ہے۔''

شبن نے جیب سے پائل نکال کر اس کے چہرے کے آگے بجائی۔

''پائل!''

وہ کود کر اس کے قریب آ گئی۔

''دکان پر ایک بیچنے والا آیا تو میں نے تیرے لیے خرید لی۔''

شبن نے سرگوشی کی۔

''لا پیر لا۔''

رانو نے پیر آگے بڑھا دیا۔

''چل اب آنکھیں بند کر۔''

شبن نے پائل کھولتے ہوئے کہا۔

رانو نے پائنچہ اوپر اٹھایا اور پیر آگے کر دیا۔ شبن نے اسے پائل پہنا دی۔ شبن کا ہاتھ لگتے ہی اسے لگا جیسے بجلی نے اسے پکڑ لیا ہو۔

''تیرے پیر کتنے نرم ہیں۔''

شبن نے اس کے پیروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''چل ہٹ بے شرم۔''

اور وہ دوڑ کر پیڑ پر پڑے جھولے پر بیٹھ کر جھولا جھولنے لگی۔

''اور یہ دوسری پائل؟''

شبن نے پائل ہلائی۔

''یہ تم پہن لو، شادی کے بعد میں پہن لوں گی۔''

رانو نے قہقہہ لگا کر کہا۔

شبن نے پائل کو اپنی کلائی پر لپیٹا اور مسکراتا ہوا جھولے کی طرف بڑھ گیا۔

''آج موسم کتنا پیارا ہے۔''

اس نے اس کے کان میں پھر سرگوشی کی۔

''تو.....؟''

رانو نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس جملے نے اس کے دل کو مزید دھڑکا دیا تھا۔

رانو نے شرارت بھری مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا، پائل پر ہاتھ پھیرا اور اس نے ایک زوردار جھٹکا دیا۔

''رانو تو ہمیشہ میرے ساتھ رہے گی نا''

''ہاں! اگر تم ساتھ دو گے تو ضرور۔''

''دیکھ میں تجھے زیادہ عیش تو نہ دے سکوں گا، ہاں دو وقت کی روٹی، عزت اور تن ڈھکنے کو کپڑے ضرور دے سکتا ہوں۔ دیکھ تو بھی شادی کے بعد بدل نہ جانا۔ مجھ سے زیادہ اونچی فرمائشیں نہ کیجو، تجھے تو پتہ ہے میرے اوپر دو بہنوں کی ذمہ داری بھی ہے اور اماں کی بھی۔''

رانو نے جھولا روکا اور شبن نے اس کی رسی پکڑ لی۔

''دیکھو تمہاری بہنوں نے اگر مجھ سے زیادہ چوں چراں کی تو اچھا نہ ہوگا۔ یہ سمجھ لو۔''

''ارے نہیں ..... باجی کا تو رشتہ پکا ہو چکا ہے اور چھوٹی کے بھی رشتے برابر آرہے ہیں لیکن چچا کا بہت دل ہے اسے اپنی بہو بنانے کا، ایک سال میں دونوں کی شادی ہو جائے گی ہاں تو اماں سے بنا کر رکھیو بس!''

''ہی..... ہی ہی''

رانو نے ہنس کر شبن کو دیکھا اور زور سے جھوٹا لیا۔

''اماں تو خود بڑھیا ہو چکی ہیں تمہاری، وہ میرا کیا کریں گی۔''

''رانو!''

شبن نے ناراضگی والی آواز نکالی۔

''ارے مذاق کر رہی ہوں۔ وہ میری بھی اماں جیسی ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ سال میں کتنے جوڑے بنا کر دو گے مجھے؟''

''صرف دو۔ ایک چھوٹی عید پر اور ایک بڑی عید پر، بس۔''

''نہ بالکل بھی نہ، میں تو چار جوڑے بنواؤں گی۔ عید کے علاوہ، ایک گرمی کا اور ایک سردی کا۔''

''اچھا اچھا بنا دیا کروں گا۔ بس تو مجھے گھر کا سکھ دیجو۔ اچھے اچھے کھانے پکانا سیکھ لے۔ مجھے اچھے کھانوں کا بہت شوق ہے۔''

''کیا کیا پکتا ہے تمہارے گھر؟''

رانو نے منہ پر آنے والی لٹوں کو پھر سے سمیٹا۔

روز ایک ہانڈی گوشت کا پکتا ہے۔ وہی دونوں وقت ہو جاتا ہے۔ دوپہر کو بہت مزے دار اور شام کو پھیکا پھیکا سا ہو جاتا ہے۔''

''اچھا ایسا کیوں؟''

''اس لیے کہ شام کو اماں اس میں پانی ملا کر پورا کرتی ہیں۔''

''اچھا۔'' پھر دونوں کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

شبن نے کلائی پر لپٹی پائل بجائی۔

''چل آئس کریم کھاتے ہیں۔''

شبن نے سامنے کھڑے آئس کریم والے کو دیکھ کر کہا۔

''نہ بابا نہ میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ یہیں لے آؤ۔ کتنا سکون ہے یہاں۔ میں تو ابھی جھولا جھولوں گی۔''

اس نے پھر جھوٹا لیا۔ پیر میں پڑی پائل کے گھنگھروؤں نے فضاء میں ایک مسحور کن موسیقی چھیڑ دی۔ اس کا دوپٹہ شبن کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔ ہوا کے جھونکے سے کبھی وہ اس کے کندھوں کو چھوتا تو کبھی چہرے کو چھوتا اور شبن کا دل دھڑکتا ہوا لہرا جاتا۔ ایک جھوٹے میں تو دوپٹہ اس کے منہ پر ہی رہ گیا اور جھولا آگے بڑھ گیا۔ شبن نے دوپٹہ اپنے گلے میں ڈال لیا اور اسے جھوٹا دیا۔

''چھن چھن'' کی ایک آواز آئی اور رانو آسمان میں اڑ گئی۔ شبن نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا اور آئس کریم لینے چلا گیا۔

وہ آئس کریم لایا تو رانو مستی سے جھولا جھول رہی تھی اور کچھ گا بھی رہی تھی۔ شبن نے جھولا روکا اور اسے آئس کریم دیتے ہوئے کہا۔

''میرا دل چاہتا ہے تجھ سے کچھ اور باتیں کروں۔''

شبن نے آئس کریم چاٹتے ہوئے کہا۔

''کون سی باتیں؟''

رانو نے زبان نکال کر ملائی چاٹی اور پوچھا۔

''دیکھ برا نہ مانیو، میری اور تیری باتیں..... ہماری شادی کی..... پیار کی باتیں اور.....''

''چپ..... بے شرم، جب وقت آئے گا تب کریں گے۔ جلدی سے اپنی بہنوں کو رخصت کرو اور مجھے لے جاؤ۔''

رانو نے سرخ ہوتے گالوں کے ساتھ کہا۔ ''..... اور یہ پائل؟''

''اپنے پاس رکھو۔ اسے بھی تب ہی پہنوں گی۔ ابھی تو آئس کریم کھانے دو۔ دیکھو وہ آسمان پر اڑتے بادل اور..... اس نے پھر جھوٹا لیا، چھن چھن چھن.....''

عجیب و غریب شور سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے؟ اس نے چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا۔ اس کے چاروں بہن بھائی سرکاری اسکول کے کپڑے پہنے اسے زور زور سے ہلا رہے تھے۔ اس نے چادر سے پیر نکال کر دیکھا لیکن وہ سونا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے حواس واپس آرہے تھے۔ اس نے نظریں گھما کر آنگن میں دیکھا۔ اس کی ایک سال کی منی سی بہن پانی میں چھپ چھپ کر رہی تھی اور اس کے ابا دروازے کے پاس پرانی سائیکل پر کچھ نئے اور کچھ پرانے ٹائر اور ایک بوسیدہ سا تھیلا لٹکائے جانے کے لیے تیار تھے۔ پچھلے سال اس کی اماں منی کی پیدائش کے وقت پانچ بچوں کی ذمہ داری اس پر چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئی تھیں۔

وہ گھبرا کر بستر سے اٹھی، اس کے کانوں میں ''چھن چھن'' کی آوازیں آرہی تھیں۔ پتہ نہیں یہ آوازیں پائل کی تھیں یا کچھ ٹوٹنے کی.....

❑❑❑

ڈاکٹر اسرار الحق قریشی
۱۱۷/۱۶۳، چکمنڈی، مولوی گنج، لکھنؤ
7081927863

افسانچہ

مندر کا گھنٹہ، بریک

مندر کا گھنٹہ

صادق نے اپنے والد سے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا کہ ابو مجھے بارہ ہزار روپیہ دے دیجئے ورنہ وہ میری رانی کو جلا دے گی۔ والد حیرت میں مطلوبہ رقم دے کر سکتہ میں آ گئے۔

رقیہ صادق کی دلہن بن کر کانپور کے محلہ قلی بازار آئی تھی۔ اس کی بڑی بہن کے تار دہلی سے رقیہ سے اس طرح جڑے تھے جیسے وہ اسی کے ساتھ رہتی ہو۔ اس کے نہ کوئی اولاد تھی اور نہ کام۔ وہ ہر وقت رقیہ کی زندگی میں زہر گھولتی تھی۔ شوہر کو قابو میں کرنے کے گُر رقیہ نے اسی سے سیکھے تھے۔ اس نے رقیہ کو مشورہ دیا تھا کہ اپنے شوہر کی کمزور نس پکڑ کر اپنی ضروریات پوری کیا کرو۔ صادق کی دکھتی رگ اس کی اپنی گڑیا رانی تھی جسے وہ دل و جان سے چاہتا تھا۔ رقیہ اپنی بات منوانے کے لئے کبھی اپنی معصوم بچی کو چٹکی کاٹتی اور کبھی زوردار تھپڑ رسید کرتی اس پر صادق کی جان نکل جاتی تھی۔

ایک دن رقیہ نے صادق سے بارہ ہزار روپئے کا سوٹ لانے کے لئے پیسے مانگے اور نہ دینے پر کہہ دیا کہ وہ اس کی رانی کو جلا دے گی۔ صادق یہ سن کر دہل گیا۔ اس نے بارہا کہا کہ میری معمولی تنخواہ پر اتنی ڈمانڈ نہ کیا کرو۔ ان باتوں پر رقیہ پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ وہ جب چاہتی اس کی رانی کو مندر کا گھنٹہ سمجھ کر بجا کر اپنی ہر ضرورت پوری کر لیتی تھی۔

ایک دن صادق گھر نہیں لوٹا۔ رقیہ نے تشویش میں پہلے آس پاس کے لوگوں سے دریافت کیا جب دوسرے دن بھی کوئی خبر نہ لگی تو اس نے تھانے میں گمشدگی کی رپورٹ درج کرا دی۔

گھر آ کر اسے احساس ہونے لگا کہ شاید اس کی غلطی صادق کو اتنی ناگوار ہوئی کہ اس نے گھر نہ آنے کا فیصلہ کر لیا ہوگا۔ لیکن اس خیال میں تاخیر ہو چکی تھی۔ صادق نئی دلہن کے ساتھ گھر میں داخل ہو کر رقیہ سے یہ کہہ رہا تھا کہ ابھی بھی اگر وہ اس کی کم آمدنی میں رہنا چاہتی ہے تو رہ سکتی ہے ورنہ دروازے جانے کے لئے کھلے ہیں۔

رقیہ سوتن کا چہرہ دیکھ کر حیرت میں تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ صادق اتنا بڑا قدم اٹھا لے گا۔ صادق کے والد نے رقیہ کا الگ نظم کر کے نئی بہو کو علیحدہ بندوبست اس لئے کیا تھا کہ وہ قدیم اقدار کے پاسدار تھے۔

اب رقیہ اپنی گڑیہ کے ساتھ بیوہ جیسی زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔ محفل میں اچھا دکھنے کے خیال میں وہ شوہر کی نگاہِ محبت سے محروم ہو چکی تھی اور صادق نے ہمت جٹا کر نئی زندگی کا آغاز کر دیا تھا۔

بریک

نمرہ اپنے والدین کی لاڈلی بیٹی تھی۔ انٹر کے امتحان قریب ہونے کے باوجود گھر کے کام بخوبی انجام دیتی تھی۔ اپنے والد ڈاکٹر فہیم کے ساتھ کالج جاتی تھی۔ ان سے اس لئے زیادہ مانوس رہتی تھی کیونکہ وہ اپنی ہونہار بیٹی کا خیال رکھتے تھے۔ وہ اپنی بیٹی کو ہیرہ کہتے تھے۔ انہیں اپنی بیٹی کی ذہانت پر ناز اور متانت پر فخر تھا۔ اس کے مستقبل کو لے کر بڑے تانے بانے بن رکھے تھے کہ اس طرح اس کے خواب شرمندۂ تعبیر کروں گا بلکہ جو بھی بن پڑے گا کروں گا۔

نمرہ نے امتحان کی تیاری محنت سے کی تھی۔ پہلا پرچہ دے کر کالج سے نکلتے ہی اس نے اپنے ابو کی جانب فرط مسرت سے دیکھا اور قریب آتے ہی سرگوشی کی کہ بہت اچھا امتحان ہوا۔ سب کر لیا۔ والد نے زیر لب مسکرا کر اپنی اسکوٹر اسٹارٹ کی اور گھر کی جانب روانہ ہوئے۔ خوشی کے ماحول میں گفتگو کرتے ہوئے دونوں آہی رہے تھے کہ سامنے ایک ڈالے پر کچھ لوہے کے اینگل لدے جا رہتے تھے۔ ڈاکٹر فہیم کو یقین تھا کہ فاصلہ بنائے رکھیں گے اور نزدیک آنے پر بریک لگا دیں گے لیکن یہ بھول گئے تھے کہ آجکل اپنی ڈرائیونگ سے زیادہ سامنے والے کی ڈرائیونگ پر نظر رکھی جاتی ہے۔ اچانک ڈالے نے بریک لگا دیا۔ ڈاکٹر فہیم لاکھ پر اعتماد ہونے کے خود جھک گئے اور اینگل نمرہ کے ماتھے پر اتنی زور سے لگا کہ خون کا فوارہ جاری ہو گیا۔ دونوں نیچے گرے۔ ڈاکٹر فہیم کو تو کم چوٹ آئی لیکن نمرہ پر نظر پڑتے ہی انہوں نے دیکھا کہ بے تحاشہ خون نکلنے سے اس کی موت واقع ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر فہیم اپنی نوجوان بیٹی کی لاش دونوں ہاتھوں میں لئے جامد و ساکت کھڑے تھے۔ کچھ دیر پہلے جس بیٹی کے لئے سنہرے خواب آنکھوں میں سجائے تھے وہ ہی آنکھیں اب اشکبار تھیں۔ اس وقت تو وہ یہ سوچ رہے تھے کہ کوئی آئے اور انہیں اس حالت میں گھر تک پہنچانے میں مدد کر دے۔ بیٹی کی حادثاتی موت کا صدمہ لئے ڈاکٹر فہیم پریشان تھے کہ وہ اپنی شریک حیات کو کس طرح سمجھائیں گے؟ کیا کہیں گے اس سے کہ ان کا بریک کیوں نہیں لگا؟ کن خیالوں میں گم ہو کر گاڑی چلا رہے تھے؟ یہ غفلت کیوں ہوئی؟

حادثہ کی خبر پہلے ہی پہنچنے سے گھر میں صف ماتم بچھ چکی تھی۔ اہلیہ صرف نمرہ کا نام لیتیں اور بے ہوش ہو جاتی تھیں۔ خواتین کی گریہ و زاری سے پورا گھر بیت الحزن بن گیا تھا۔ میت کے غسل کا انتظام ہوا۔ غمزدہ اہل محلہ اور سوگوار اعزاء نمرہ کس جنازہ اپنے کاندھوں پر لئے قبرستان کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ڈاکٹر فہیم نے اپنی بیٹی کو سپرد لحد کیا اور خود کلامی کرتے ہوئے کہا کہ بیٹا رانی تم اس طرح جاؤ گی سوچا نہ تھا۔ تم میری طاقت تھیں، تم نے مجھے کمزور ہی نہیں توڑ کر رکھ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں جنت الفردوس عطا کرے اور میری خطا کو معاف فرمائے کہ میں نے وقت پر بریک نہ لگایا اور تمہاری زندگی کو بریک لگ گیا۔

❑❑❑

محمد زماں

بتھور کریم الدین پور غازی پور

9369586796

افسانچہ

بصیرت

شہر کی پرانی بستی کے اس محلے میں جہاں ہر گھر کی دیواریں دوسرے گھر سے جڑی تھیں، وہیں فرحین اور اطہر کا چھوٹا سا گھرانہ آباد تھا۔ فرحین جتنی نیک سیرت تھی، اتنی ہی سگھڑ اور ہنس مکھ بھی۔

اطہر، جو ایک دفتر میں کلرک تھا، اکثر شام کو تھکا ہارا آتا تو فرحین کی چائے اور اس کی باتوں سے اس کی ساری تھکن دور ہو جاتی۔ ایک دن اطہر گھر آیا تو دیکھا فرحین جلدی جلدی برتن سمیٹ رہی ہے اور اس نے چادر بھی استانیوں والے وقار سے اوڑھ رکھی ہے۔

ارے بھئی، خیر تو ہے؟

آج سورج مغرب سے نکلا ہے کیا؟ ابھی تو چائے کا وقت تھا اور تم باہر جانے کی تیاری میں ہو؟ اطہر نے جوتے اتارتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ فرحین نے ایک شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا:

اطہر صاحب!

بس سمجھ لیں کہ آج کل میری مصروفیات ذرا بڑھ گئی ہیں۔ آپ چائے خود بنا لیں گے یا میں واپسی پر آ کر کڑک چائے پلاؤں؟ اطہر نے مصنوعی غصے سے کہا: واہ! شوہر گھر آئے اور بیوی کہے چائے خود بنا لو۔ لگتا ہے میری حکومت اب ختم ہو رہی ہے۔

کہاں جا رہی ہو ویسے؟ فرحین نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے ہنس کر کہا: بس ای 'خفیہ مشن پر! زیادہ سوال نہ کریں، ورنہ رات کا کھانا بھی خود بنانا پڑ سکتا ہے۔

کچھ دن تو ہنسی مذاق میں گزر گئے، لیکن ایک دن اطہر کا چھوٹا بھائی، جو خود کو 'محلے کا جاسوس سمجھتا تھا، ہانپتا ہوا اطہر کے پاس آیا۔ بھائی! آپ کی متقی بیوی... میرا مطلب ہے بھابھی، آج کل اس بدنام گلی میں دیکھی جا رہی ہیں جہاں شرافت کا نام و نشان نہیں۔ اطہر کا ماتھا ٹھنکا۔" کیا بکواس کر رہے ہو؟

فرحین اور وہ گلی؟ ناممکن! لیکن تجسس کی چنگاری بھڑک چکی تھی۔ اگلے دن جب فرحین خاموشی سے نکلی تو اطہر نے دبے قدموں اس کا پیچھا شروع کیا۔ وہ دل ہی دل میں خود کو کوس رہا تھا:

یا اللہ! اگر یہ سچ ہوا تو میں محلے کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ فرحین تیزی سے گلیوں اور کوچوں کو پار کرتی ہوئی اس علاقے میں پہنچی جہاں کی دیواریں بھی سیاہ معلوم ہوتی تھیں۔ بدبو، شور اور غلاظت۔ اطہر کے پیروں تلے زمین نکل رہی تھی۔

آخر فرحین یہاں کیوں آئی ہے؟ اس نے دیکھا کہ فرحین ایک بوسیدہ لکڑی کے دروازے کے پیچھے غائب ہو گئی۔ اطہر کا غصہ اب ہمالیہ کی چوٹیوں کو چھو رہا تھا۔ اس نے سوچا: آج تو فیصلہ ہو کر رہے گا! اس نے ایک زوردار دھکا دے کر دروازہ کھولا۔

فرحین!

یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟

اس کی آواز گرجی۔ دروازہ کھلتے ہی اطہر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ سامنے کا منظر کچھ یوں تھا:

کمرے میں فرحین ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھی تھی اور اس کے سامنے زمین پر آٹھ دس بچے بیٹھے تھے جن کے ہاتھ میں پھٹی پرانی کتابیں تھیں۔ ایک چھوٹا بچہ، جس کی ناک بہہ رہی تھی، فرحین کا دوپٹہ پکڑ کر کہہ رہا تھا:

باجی! الف کے بعد کیا آتا ہے؟ فرحین نے اطہر کو دیکھ کر پہلے تو ایک گہرا سانس لیا، پھر مسکرا کر بولی: آئیے اطہر صاحب!

آپ تو بڑے غصے میں لگ رہے ہیں۔ کیا آپ بھی ان بچوں کو سب سے بدتمیزی سکھانے آئے ہیں یا ب سے بہادری؟ اطہر شرمندگی کے سمندر میں غرق ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہاں ایک پرانے تختہ سیاہ پر چاک سے خوبصورت حروف لکھے تھے۔ فرحین... یہ سب کیا ہے؟

اطہر نے دبی آواز میں پوچھا۔ فرحین کا لہجہ اب سنجیدہ ہو گیا:

اطہر، ان بچوں کا کیا قصور کہ یہ اس گلی میں پیدا ہوئے؟

معاشرہ انہیں حقیر سمجھتا ہے، لیکن یہ بھی تو انسان ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ پڑھ لکھ کر اس گلی سے باہر نکلیں۔ یہ میرا وہ خفیہ مشن تھا جس کا میں ذکر کرتی تھی۔

اطہر نے بچوں کی طرف دیکھا جو ڈرے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس نے ایک بچے کے سر پر ہاتھ رکھا اور فرحین سے کہا:

فرحین، میں کتنا بیوقوف تھا کہ تمہاری نیکی پر شک کیا۔ ویسے ایک بات کہوں؟ جی کہیے؟

فرحین نے چھیڑا۔ تمہاری استانی والی شکل اس نقاب میں بڑی رعب دار لگ رہی تھی۔

میں تو سچ مچ ڈر گیا تھا! اطہر نے ہنستے ہوئے کہا۔ فرحین نے قہقہہ لگایا:" اچھا؟

تو اب سے آپ روزانہ ان بچوں کے لیے پنسلیں اور کاپیاں لائیں گے، یہی آپ کی سزا ہے! اطہر نے خوشی سے سر ہلایا۔

اس دن اس بدنام گلی میں صرف ایک استانی نہیں تھی، بلکہ ایک ایسا استاد بھی مل گیا تھا جو اب ان بچوں کے مستقبل کا بوجھ بانٹنے کے لیے تیار تھا۔

□□□

بے نظیر
بھتور، غازی پور
8429413487

تبصرہ

خالد محمود: شخصیت اور ادبی خدمات

خالد محمود: شخصیت اور ادبی خدمات" یہ کتاب اردو دنیا کی معروف علمی شخصیت پروفیسر خالد محمود کے فن اور شخصیت پر لکھی گئی ایک گراں قدر دستاویز ہے۔ کتاب کے مندرجات اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اسے نہایت عرق ریزی اور محبت سے ترتیب دیا گیا ہے، تاکہ خالد محمود صاحب کی کثیر الجہت شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا جا سکے۔ نمایاں پہلو جامع سوانحی اشارے: کتاب کے آغاز میں دیئے گئے سوانحی خاکے سے معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر صاحب کی علمی بنیادیں مدرسہ ریاض المدارس سے استوار ہوئیں اور پھر سیفیہ کالج بھوپال سے ہوتی ہوئی جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی جیسے عظیم ادارے تک پہنچیں۔ ان کا تعلیمی سفر اور پچاس سالہ تدریسی تجربہ (جس میں چالیس سال جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام ہیں) نئی نسل کے لیے مشعل راہ ہے۔

تحقیقی و تنقیدی گہرائی کتاب کے ابواب اور فہرستِ مضامین ظاہر کرتے ہیں کہ خالد محمود صاحب کا خاص میدان سفرنامہ، طنز و مزاح اور غزل ہے۔ ان کے پی ایچ ڈی کے موضوع "اردو سفرناموں کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ" نے اس صنف میں نئی راہیں متعین کی ہیں۔ مشاہیر ادب کی آراء فہرستِ مضامین میں اردو ادب کے مایہ ناز ناموں (جیسے پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر شافع قدوائی اور دیگر) کی شمولیت اس بات کا ثبوت ہے کہ علمی حلقوں میں خالد محمود صاحب کا کتنا احترام اور وقار ہے۔ تخلیقی تنوع کتاب میں نہ صرف ان کی شخصیت پر مضامین شامل ہیں، بلکہ ان کی شاعری، نثری خدمات، اور بحیثیت معلم ان کے کردار پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ خاص طور پر "بحیثیت شاعر" اور "بحیثیت معلم" کے گوشے ان کی شخصیت کے مختلف رنگوں کو واضح کرتے ہیں۔ حاصل کلام: "خالد: شخصیت اور ادبی خدمات" صرف ایک سوانحی مجموعہ نہیں ہے، بلکہ یہ بیسویں اور اکیسویں صدی کے اردو ادبی منظر نامے کا ایک اہم باب ہے۔

یہ کتاب ان تمام قارئین اور محققین کے لیے ایک ضروری حوالہ (Reference) ہے جو جدید اردو نثر، سفرنامہ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی علمی روایت کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ موجود فہرست اور سوانحی خاکے کا مزید گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد، کچھ ایسے پہلو سامنے آتے ہیں جو پروفیسر خالد محمود کی انفرادی پہچان کو مزید مستحکم کرتے ہیں۔ اس کتاب کے مشمولات پر ادبی و علمی قد و قامت کا جائزہ پیر وفیسر خالد محمود کی زندگی کا ایک بڑا حصہ ریاست مدھیہ پردیش (سرونج اور بھوپال) میں گزرا اور پھر وہ دہلی کی علمی فضاؤں (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کا حصہ بنے۔ ان کی شخصیت پر ان دونوں مقامات کے تہذیبی اثرات نمایاں ہیں۔

کتاب میں شامل مضامین کے عنوانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھوپال کی علمی روایت اور دہلی کی تحقیقی سنجیدگی کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فن طنز و مزاح میں انفرادیت کتاب کے مطالع سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر لکھے گئے مضامین میں "طنز و مزاح" کا خاص ذکر ہے۔ اردو ادب میں تحقیق اور تنقید کے ساتھ ساتھ شگفتہ بیانی کا امتزاج بہت کم لوگوں کے ہاں ملتا ہے۔ خالد محمود صاحب نے سنجیدہ علمی کاموں کے ساتھ ساتھ مزاحیہ حس لطافت کو بھی زندہ رکھا، جو ان کی نثر کو بوجھل ہونے سے بچاتی ہے۔ ایک مثالی معلم کا عکس فہرست میں "بحیثیت معلم" اور "تاثرات" کے حصوں میں شاگردوں اور ہم عصروں کی بڑی تعداد شامل ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ صرف کتابی شخصیت نہیں تھے، بلکہ انہوں نے افراد سازی کی ہے۔ اس کتاب سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ کتاب کو بہت قرینے سے ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے: پہلا حصہ: شخصیت اور سوانح۔ دوسرا حصہ: ان کی مختلف اصنافِ ادب (نظم، غزل، نثر) پر تنقیدی آراء۔ تیسرا حصہ: معاصرین اور شاگردوں کے تاثرات۔ یہ ترتیب اس کتاب کو ایک باقاعدہ "ریسرچ دستاویز" بنا دیتی ہے جسے آنے والے وقت میں پروفیسر صاحب پر کام کرنے والے محققین ایک بنیادی حوالے کے طور پر استعمال کریں گے۔

❑❑❑

کوائف

نامِ کتاب : خالد محمود: شخصیت اور ادبی خدمات
مرتبین : سیفی سرونجی/ استوتی اگروال
مبصر : بے نظیر
ضخامت : 528 صفحات
قیمت : -/500 روپئے
ناشر : کریٹیو اسٹار پبلی کیشنز

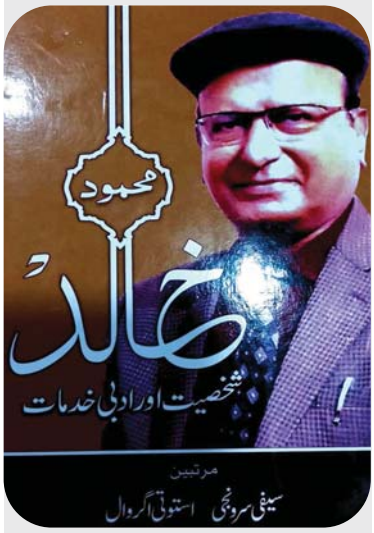

ہشام غزالی

عمر ہاؤس، مولوی گنج، امین آباد لکھنؤ

7007906923

ترقیات

اتر پردیش: فارما اور صحت کے شعبے میں سرمایہ کاری

اتر پردیش آج اپنی روایتی پہچان سے آگے بڑھ کر ٹرسٹ، ٹرانسفارمیشن اور ٹائملی ڈیلیوری (بھروسہ، تبدیلی اور بروقت فراہمی) کے ایک مثالی ماڈل کے طور پر ابھر رہا ہے۔ وزیر اعظم نریندر مودی کے ترقی یافتہ بھارت کے عزم کو حقیقت میں بدلنے کے لیے ریاست، فارماسیوٹیکل سیکٹر میں مینوفیکچرنگ اور جدت طرازی کا ایک بڑا مرکز بننے کی راہ پر گامزن ہے۔ صنعتی ترقی کے لیے 'ٹرپل ایس' ماڈل ریاستی حکومت نے سرمایہ کاروں کے لیے ٹرپل ایس' ماڈل یعنی safety (تحفظ Stability (استحکام (اور Speed) رفتار (کی ضمانت دی ہے۔ اتر پردیش نہ صرف ملک کی سب سے بڑی کنزیومر مارکیٹ ہے، بلکہ یہاں فارما سیکٹر کے لیے عالمی معیار کا انفراسٹرکچر اور ہنر مند افرادی قوت بھی وافر مقدار میں موجود ہے۔ بنیادی ڈھانچے کی توسیع اور اہم منصوبے ریاست کے مختلف اضلاع میں فارما اور ہیلتھ کیئر کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے کلسٹر پر مبنی ترقی کی جا رہی ہے: قدرتی وسائل سے مالا مال للت پور میں ریاست کے پہلے فارما پارک کے لیے زمین کے حصول کا کام کامیابی سے مکمل ہو چکا ہے، جسے 'ہب اینڈ اسپوک' ماڈل پر تیار کیا جا رہا ہے۔

جیور انٹرنیشنل ایئر پورٹ کے قریب تقریباً 350 ایکڑ رقبے پر میڈیکل ڈیوائس پارک کی تعمیر جنگی پیمانے پر جاری ہے، جس میں اب تک 100 سے زائد فارما کمپنیاں شامل ہو چکی ہیں۔ سرمایہ کاروں کی سہولت کے لیے یو. ایس. ایف. ڈی. اے. (USFDA) ٹیسٹنگ لیب کے قیام کا عمل بھی شروع کر دیا گیا ہے۔ لکھنؤ میں ایک ورلڈ کلاس فارما انسٹی ٹیوٹ کی تعمیر کے ساتھ ساتھ گوتم بدھ نگر، بریلی اور مشرقی اتر پردیش میں بھی نئے فارما پارکس کی منصوبہ بندی کی گئی ہے۔ آئی آئی ٹی کانپور کے تعاون سے 1,200 کروڑ روپے کی لاگت سے میڈٹیک سینٹر آف ایکسی لینس تیار کیا جا رہا ہے۔

لکھنؤ پہلے ہی CDRI اور NBRI جیسی چار قومی سطح کی مرکزی لیباریٹریوں کا گڑھ ہے، جو تحقیق کے شعبے میں ریاست کی پوزیشن کو مزید مستحکم کرتی ہیں۔ پالیسی اصلاحات اور متوازن ترقیاتر پردیش اب پالیسی پیرالسس (پالیسیوں کے تعطل) کے دور سے باہر نکل چکا ہے۔ موجودہ وقت میں 34 سیکٹورل پالیسیاں نافذ ہیں جو سرمایہ کاروں کو شفافیت اور تحفظ فراہم کرتی ہیں۔ 'سنگل ونڈو پلیٹ فارم' کے ذریعے مراعات کی بروقت فراہمی اور 'فارچیون- 500 پالیسی' کے ذریعے عالمی سرمایہ کاری کو مدعو کیا جا رہا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ ترقی صرف صنعتی نہیں بلکہ ماحولیاتی طور پر بھی متوازن ہے۔ گزشتہ 9 برسوں میں مادی ترقی کے ساتھ ساتھ ریاست کے جنگلاتی رقبے (Forest Cover) میں بھی نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ اقتصادی اثرات اور روزگاران منصوبوں کا براہ راست فائدہ عام شہری کو پہنچ رہا ہے: مقامی روزگار: للت پور اور جیور جیسے علاقوں میں ہزاروں نئے روزگار کے مواقع وضع ہو رہے ہیں۔ عالمی ساکھ: فارچیون- '500 کمپنیوں کی آمد سے اتر پردیش کا نام عالمی معاشی نقشے پر ایک 'سرمایہ کاری دوست' ریاست کے طور پر ابھرا ہے۔

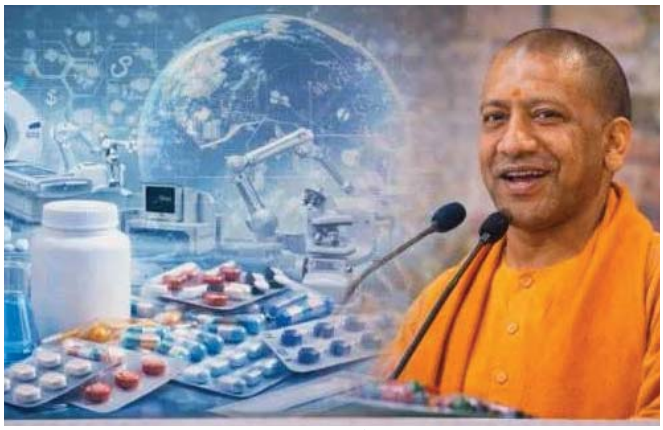

اتر پردیش کی اس صنعتی چھلانگ کے پیچھے مضبوط انفراسٹرکچر کا بڑا ہاتھ ہے: ایکسپریس ویز کا جال: پوروانچل، بندیل کھنڈ اور گنگا ایکسپریس ویز کی بدولت خام مال کی سپلائی اور تیار شدہ ادویات کی ملک بھر میں ترسیل اب پہلے سے کہیں زیادہ تیز اور سستی ہو گئی ہے۔ ملٹی موڈل کنیکٹیویٹی: جیور انٹرنیشنل ایئر پورٹ کے قریب میڈیکل ڈیوائس پارک کا قیام اس بات کی ضمانت ہے کہ یہاں بننے والی مصنوعات براہ راست عالمی منڈیوں تک پہنچ سکیں گی۔ اس صنعتی انقلاب کا ایک اہم پہلو عوام کو سستی اور معیاری ادویات کی فراہمی ہے۔ سستی ادویات: مقامی سطح پر بڑی فارما کمپنیوں کی مینوفیکچرنگ سے ادویات کی قیمتوں میں کمی آنے کا امکان ہے، جس کا براہ راست فائدہ ریاست کے کروڑوں عوام کو ہوگا۔ میڈیکل ٹورازم: صحت کے شعبے میں اس بڑے پیمانے کی سرمایہ کاری سے اتر پردیش مستقبل قریب میں میڈیکل ٹورازم کا مرکز بن سکتا ہے، جہاں پڑوسی ریاستوں اور ممالک سے لوگ علاج کے لیے آئیں گے۔

❑❑❑

جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ بھارتیندو ناٹیہ اکیڈمی کے ذریعہ منعقد پروگرام میں خاتون فنکارہ کو اعزاز دیتے ہوئے۔

جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ ''اسکول چلو ابھیان'' کے تحت خاتون کو اعزاز سے نوازتے ہوئے۔

वर्ष : 80 अंक 1
मई, 2025
मूल्य : 15 रु./–
वार्षिक मूल्य : 180 रु./–

उर्दू मासिक, **नया दौर**
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ – 226 001

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006–08
ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. स्वत्वाधिकारी के लिए **विशाल सिंह**, निदेशक, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. लखनऊ द्वारा प्रकाशित तथा प्रकाश एन. भार्गव, प्रकाश पैकेजर्स, प्रथम तल, शगुन पैलेस, 3–सप्रू मार्ग, लखनऊ द्वारा मुद्रित, सम्पादक– **आशिया ख़ातून**